U32266. P. 26-1209

Title - RANG BAST; MASHRIQI -O- MAGHRIB KI SHAHE-
-KAAR NAZMON KA AZAD TARJUMA.

Creator - Nawab Mirza Jafar Ali Khan Asar Lucknavi.

Publisher - Urdu Academy (Lahore).

Date - 1942.

Pages - 86.

Subjects - Urdu Shayari - Intikhab Kalaam - Shayari; Europi Adab - Intikhab Kalaam - Tarajum.

To my dearest friend, Ram Babu Saksena (R.B.)
with affectionate regards.
Asar
24/9/43

رنگ بست

مشرق و مغرب کی شاہکار نظموں کا آزاد ترجمہ

مترجمہ
نواب میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

اردو اکیڈمی لاہور

ناشر
اردو اکیڈیمی لاہور

مطبوعہ
دین محمدی پریس لاہور

مندرجات

سنسکرت

بنگالی

عربی

محمد صدیق خوشنویس لاہور

تعارف

اردو میں نظمیہ شاعری کی جو تحریک حالی اور آزاد نے شروع کی اس کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہوا۔ اور ہونا بھی کس طرح کہ خود مولانا حالی کو اعتراف تھا کہ انہیں انگریزی شاعری سے بہت کم واقفیت تھی۔ مگر ان کی کوشش یہ تھی کہ اردو شاعری میں انگریزی شاعری کے اثرات بنیادی حیثیت اختیار کریں۔ چنانچہ آزاد اور حالی کی نیچرل شاعری نہ نیچرل ہے نہ شاعری۔ یہ نظمیں عموماً "جواب مضمون" کے انداز کی ہیں۔ ان میں نہ خلوص جذبات ہے نہ جدت! ـــــ اور پھر ملک کی فضا ایسی تھی کہ اس قسم کی شاعری کا نشو و نما پانا محال تھا۔ پرانی مغلیہ معاشرت خود بخود زوال پذیر ہو چکی تھی۔ غدر کے واقعات سے نئی سلطنت کی حکمرانی لوگوں کے جسموں پر تو ہو گئی مگر دل و دماغ کو اس سے نفور تھا۔ اور جب آہستہ آہستہ نئے دور کے اثرات ہندوستانی سماج میں پھیلنے لگے، پرانے زخم مندمل ہونے لگے۔ تو لوگوں نے واقعیت سے کام لے کر اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ عوام میں انگریزی تعلیم کا چرچا ہونے لگا۔ مگر جب تک زندگی کی راہیں اس قدر پیچیدار ہو چکی تھیں کہ نیچرل شاعری اور گل و گلزار کی باتیں فرحت افزا سہی مگر بعید از حقیقت معلوم ہونے لگیں۔

اس دور کے تمام موقر شعرا اپنی قابل توجہ نظموں میں سماجی اور ملّی مسائل کے متعلق غور و فکر کرتے نظر آتے ہیں۔ فن برائے فن یا فن برائے تفنن کا دائرہ غزل تک محدود رہا۔ نظم بُری ہوتی تو وعظ بن گئی اچھی ہوئی تو تنقید حیات! ـــــ اور مغربی ادب کا اثر بالکل سطحی ہی رہا۔ یہ مسدس حالی۔ اکبر الٰہ آبادی۔ شکوہ وغیرہ کا دور ہے!۔

اب نئے رنگ ڈھنگ سے طبیعتیں خوگر ہونے لگیں۔ ایک خاص قسم کی اقدار بننے لگیں اور سماج ایک معین نہج پر ڈھلنے لگی۔ مسائل حیات واضح ہو گئے اور ان کا حل بھی معلوم ہو گیا۔ عمل کی دنیا میں ہیجان سہی مگر غور و فکر کی دنیا میں اضطراب کم ہو گیا۔ شاعر پھر گیت گانے لگے! نظم میں بھی غزل کا سا تفنن اور تفریح کا

تک آنے لگا۔

انگریزی ادب کے مختلف اثرات ہمارے ادب میں نمایاں ہونے لگے۔ مشہور انگریزی نظموں کے ترجمے، انگریزی نظامِ قوافی کا رواج، مغربی انداز کے تجربات عام ہونے لگے۔ بلینک ورس، سانیٹ، آزاد نظم وغیرہ اردو شاعری کی اصطلاحات ہو گئیں۔ اور یہ عمل آج سے کچھ سال پہلے تک بڑے زور سے جاری تھا۔ یہاں تک کہ اردو شاعری محض انگریزی شاعری کی نقالی بنتی جا رہی تھی۔ ہماری سماج کا بھی یہی حال تھا۔ کھاتے پیتے اور اٹھتے بیٹھتے لوگ گہرے فرنگی رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔

سیاسی اور اقتصادی اور سماجی دنیا میں اس کے خلاف ایک تیز ردِ عمل ہوا اور یہ ردِ عمل ایسا تھا جو کبھی حد سے بڑھ جاتا تھا۔ بعض لوگ غصے سے اندھے ہو کر ہمارے رہنما کہنے لگے کہ آج سے ہزار سال پہلے کی دنیا میں چل بسو۔ اور اس میں ہندو اور مسلم دونوں برابر کے شریک تھے۔ آج کے حالات ناسازگار ہیں۔ بدلے نہیں جا سکتے۔ پرسوں اترسوں کے حالات کو دوبارہ استوار کرو۔ مگر یہ نعرہ بھی پرانا ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں یورپ میں بھی یہ پکار اٹھی تھی۔ یورپ کے جلاہوں نے کھادیاں تباہ ہوتی دیکھ کر کپڑے کی مشینوں اور کارخانوں کو آگ لگا دی۔ بلوے ہوئے۔ خون خرابہ ہوا مگر دنیا اپنی رفتار پر قائم رہی۔ اس دور کی یادگار مشہور جرمن ڈرامہ نگار ہاپٹمن کا معرکہ آرا ڈرامہ "جلاہے" ہے۔ ہمارے ہاں بھی شاید کوئی اسی طرح کا ناول یا کھیل لکھا جائے۔ سیاسی دنیا کی اس رومانی تحریک کا عکس آرٹ کی دنیا میں بھی نظر آتا ہے۔

ہندوستان کی نئی مصوری تو اس بوجھ کے نیچے ایسی دبی کہ اب تک سسک رہی ہے۔ اجنتا کی غاروں اور دیوتاؤں اور پرانی محلسراؤں اور اساطیرِ کہنہ کی یادوں نے مصوری کو اچھا خاصہ قبرستان بنا رکھا ہے۔ شاعری بھی اس مردہ پرستی سے بالکل دامن نہ بچا سکی۔ اور ہمارے قدیم ادب اور آرٹ کے اچھے اثرات تھے اس سے بہت کم شعرا اور ادیب فائدہ اٹھا سکے۔

ہم نے مانا کہ تنگنائے غزل میں وسعتیں بقدرِ ذوق نہیں، اور یہ یکسانیٔ قافیہ نظامِ مسلسل خیالات کے اظہار میں مشکلات پیدا کرتا ہے لیکن اس کا حل خود ہماری روزمرہ کی موسیقی میں موجود تھا۔ ٹھمری کے بول میں قوافی ہی نہیں۔ بحر کی بھی آزادی ہے اور محمد شاہ رنگیلے کے درباری سدا رنگ نے جو ٹھمری کے الفاظ وضع کئے ہیں۔ وہ آجکل کے ہندی اردو کے بہترین گیتوں سے بہتر ہیں ۔۔

اور پھر شاعری کے اوضاع و اصناف میں اور نظموں کی ساخت میں تبدیلی تو جب ہوگی کہ خیالات

میں تبدیلی ہو اور نئے خیالات کی رہنمائی کیلئے انگریزی شاعری ہی پر کیوں اکتفا کیا جائے۔

یہ درست ہے کہ اردو غزل کا معشوق اور عشق کا تصور بہت پست ہے۔ تو اس کیلئے سنسکرت اور عربی کی شاعری کی طرف بھی رجوع کیا ہو تا صحت مند جذبات انگریزی شاعری کا اجارہ نہیں - اور شاعری محض عاشقی کا نام نہیں مختلف زبانوں میں مختلف موضوعات پر مختلف طریقے سے سوچا اور لکھا گیا ہے بلکہ مختلف خیالات نے مختلف طرز تحریر پیدا کئے ہیں یوں کہئے کہ نئے خیالات کا اظہار نئی طرح سے ہو سکتا تھا

مگر اردو کے شعراء نے باہر کی دنیا سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا اس امر میں اردو کے مختصر افسانہ نویس سب پیش پیش رہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نثر کا نثر میں ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا قریباً محال ہے پیش نظر مجموعہ نظم "رنگ بست" اثر خامہ نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی جس میں مشرق و مغرب سنسکرت، ہندی، عربی، یونانی، اطالوی، روسی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی کی نظموں کا آزاد ترجمہ شامل ہے کئی اعتبار سے اردو میں ایک یادگار کتاب ہے!-

اردو زبان اور اردو شاعری کے ایک استاد کامل نے جیسے انگریزی ادب کی نزاکتوں سے پوری پوری واقفیت ہے، انگریزی سے اردو نظم میں ترجمے کئے ہیں استادانہ زبان، استادانہ بندش، استادانہ خیالات، اس سے بہتر امتزاج اور کیا ہوگا —

الگ الگ نظموں کے نام گنواؤں اگر اس مجموعے میں فقط دو ہی نظمیں ہوتیں تو بھی اسے اس دور کے اہم ترین ادبی کارناموں میں شمار کیا جاتا۔

ایک تو ڈانٹے کے شاہکار [illegible] جہنم کے ایک باب "Canto" کا ترجمہ نمونہ کے طور پر مسدس میں کیا گیا ہے اور ہر بند میں التزام ہے کہ ٹیپ یعنی پانچویں چھٹے مصرعے (آخری شعر) میں قافیہ کے ساتھ ایک مستقل ردیف بھی ہے یہ کوئی معمولی فنی خوبی نہیں! —

اور نئے ادباء کیلئے حیرت اور رشک کا مقام ہے کہ "Man with the Hoe" کا ترجمہ نظم معرّا (بلینک ورس) میں ہوا ہے اور اس طرح کہ گمان نہیں گزرتا کہ قافیہ موجود نہیں! — یہ وہ جادو ہے جو ہمارے جدید بلینک ورس لکھنے والوں کے بس کا نہیں اور جس کے نہ ہونے سے نظم بلا قافیہ اردو میں پنپ نہیں سکی - یہاں اصناف سخن کے ماہر کامل مرزا اثر لکھنوی کی یہ نظم اردو میں بلینک ورس کا بہترین نمونہ

ہے۔ ہر اعتبار سے کامیاب تجربہ ہے!۔ تو گویا یہ شرف بھی ان اگلے وقتوں کے لوگوں کو نصیب ہوا۔
اور جو سوچو تو یہ کوئی ایسا بڑا اسرار راز نہیں کہ سمجھا نہ جا سکے۔ قافیہ صوت کی یگانگت کی وجہ سے توجہ کو مرکوز رکھتا ہے۔ قافیہ نہیں تو اس کی جگہ واضح لفظی تصویریں اور صوتی آہنگ ہونے چاہئیں سو وہ اس نظم میں موجود ہیں۔ مصرع کے آخر کے الفاظ جہاں قافیہ ہونا چاہئے عموماً ایسے ہیں کہ دو دو ساکن حروف جمع ہیں اس طرح آواز کی رفتار میں ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ اور آہنگ پیدا ہوتا ہے ایک لٹک سی آجاتی ہے جو عموماً قافیہ کا خاصہ ہے!

یہ راز تو تجزیے سے معلوم ہو گیا۔ مگر نثر میں اسے بیان کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔ شاعر اسے غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہے اور جب تک طبیعت میں شکتی اور جوہر نہ ہو کچھ نہیں ہو سکتا۔

ان ترجموں میں معانی کے اعتبار سے سب سے زیادہ معرکہ کی نظمیں وہ ہیں جو عربی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ ابن عربی کی نظم تاریخ ادب کے اعتبار سے غیر معمولی ہے ترجمے میں عربیت پوری طرح قائم ہے محبت کا مردانہ تصور اور شعرا کیلئے مشعل راہ کا کام دیگا اور جو فلسفیانہ نظم ہے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے اس سے اردو میں ایک نئی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ راستہ وہ ہے جو علامہ اقبال نے پہلے پہل اردو میں نکالا اور اس نظم سے وہ راستہ ایک نئی شاہراہ بن گیا ہے۔ ہماری زبان کی ممکنات اس قدر وسیع ہو گئی ہیں کہ اگر ہمارے شعراء ان سے فائدہ اٹھائیں تو اردو شاعری دنیا کے ادب میں ایک وسیع مقام حاصل کرنے کی اہل ہو جائے گی۔

اثر لکھنوی کو قدرت نے شاعر بنایا ہے اور دل و دماغ میں ایسی وسعت دی ہے کہ وہ جدید قدیم مشرق و مغرب دونوں سے بقدر ہمت و ظرف متمتع حاصل کر سکتا ہے اس لئے بھی "رنگ بست" کی اشاعت ایک بہت وسیع ادبی کارنامہ ہے ہو سکتا ہے کہ اردو شاعری پر اس کا بہت گہرا اثر پڑے اور جو یوں ہو تو یہ اردو ادب کی خوش نصیبی ہو گی اور صحیح معنوں میں ترقی پسندی ہو گی۔ اثر نے وہ کام کیا ہے جو حالی وغیرہ سے نہ ہو سکا۔

ناشر

مصوّر اور تصویر

آ مصوّر مری ناہید کی تصویر بنا!
دُور اُس سے ہوں، تجھے شکل دکھاؤں کیونکر!
وہ ہے مغرور نہ آئے گی بلاؤں کیونکر
سچ کہا حلیہ بیاں میں کروں تیرے آگے
مگر الفاظ میں گلدستہ سجاؤں کیونکر

خیر، پہلے تو گھنی زلف گرہ گیر بنا
جس میں تکمیل کی معراج پہ ہوں ظلمت و نور
دے سیاہی کو چمک فن پہ جو رکھتا ہے عبور
جب ہو یہ مرحلہ طے، شبنم گل کی نکہت
زلف میں جس کی مہک ہے، وہ کھپانا ہے ضرور

بعد ازاں ابروئے خم دار کی شمشیر بنا
اور پلکیں تلے اوپر نہ کھلی اور نہ ملی
فاصلہ ہو فقط اتنا کہ نظر کھائے فریب
اور یہ شبہ ہو مابین ہے باریک چھری
جھانکنا چاہا جہاں، دل میں چھری پیر گئی ؛

رقص کرتا ہوا اک حلقۂ تنویر بنا
یعنی آنکھیں بنا اور ایسی ستم گر آنکھیں
کر کے جو عہد کرم قتل کیا کرتی ہیں
بجلیاں جن کی شرارت سے ڈرا کرتی ہیں
سہم کر ابر کے دامن میں چھپا کرتی ہیں

تیرے جس میں ہوں گل، اک قدح شیر بنا
ورنہ رخسار کا غازہ بھی نہ ہو گا طیار
ہونٹ تو خیر، جو برساتے ہیں رنگیں انوار
اور چڑھا دیتے ہیں منہ بوسے کی دعوت دیکر

ہاتھ ملتی ہوئی محروم ہی جاتی ہے بہار

سنگِ مرمر کے کسی خواب کی تعمیر بنا
اُس کی گردن کے بنانے کا اگر سودا ہے
نہ تو یہ جسم ہے کہیں اور نہ نقشا ہے
فکر کر جتنی بھی تو چاہے، مگر کیا حاصل؟
ہے سحر کا خطِ ابیض وہی، کیا پھیکا ہے!

بیجنی رنگ کا ملبوس بدن پر بنا
اُس کے اعضا کے تناسب کا ہو پرتو جس میں
اور جھلکتی ہو ذرا جسم کی بھی ضو جس میں
کیا کوئی ہرج ہے جو زیرِ گلو کچھ ہو کھلا
پھر تخیل ہو سامانِ تگ و دو جس میں

یہ تو سب کچھ ہوا، اب رنگ میں تقریر بنا
آ مصور مری ناہید کی تصویر بنا!

(یونانی)

ٹڈا

(قدیم یونانی شاعر اناکریان کی ایک نظم سے متاثر ہو کر)

خوش نصیبی میں نہیں کوئی مقابل تیرا — دل جواں ہے ترا اور عیش ہے کامل تیرا
ملتی ہے ہر صبح تجھے شبنم کی شراب — جس کے ہر قطرے میں محلول ہے خورشید کی آب
میزباں ہے تری خود فطرتِ "عشرت پیغام" — ہاتھ سے اپنے جو دیتی ہے تجھے جام پہ جام
تو جہاں جائے ضیافت کا ہے ساماں موجود — اور ٹھہرنے کے لئے کشت و خیاباں موجود
مست ہو ہو کے ترا رقص میں آنا اُف اُف! — اپنے ہی رقص پہ خود ہاتھ سے جانا، اُف اُف!
گیت گاتا ہے عجب طرزِ دل آرائی سے — جو نکلتے ہیں فقط رُوح کی گہرائی سے
کوئی خاقان بھی مسرور نہ تجھ سا ہوگا — مطمئن ایسا، کہ خوش باش، کہ بے فکر ایسا
سب ہرے پودے بھی اور کھیت بھی ہیں ملک تری — ان کے پھل پھول بھی، بو باس بھی، رنگینی بھی
تیرے ہی واسطے زرخیز بنایا اُن کو — اور اس حسن سے ہر سمت سجایا اُن کو
لی نمی ابر سے، کی دھوپ سے گرمی حاصل — اور پھر ان میں کیا جوششِ نمو بھی شامل
آدمی جوتتا بوتا ہے زمیں تیرے لئے — کون نعمت ہے مہیا جو نہیں تیرے لئے
تو زمیندار ہے اور وہ ہے اسامی تیرا — شان عالی ہے تری، رتبہ گرامی تیرا

مشغلے ہیں ترے جتنے وہ سراسر معصوم
زندگی کا نہیں جز لطف و مدار مفہوم

نہ تو پھیلائے نفاق اور نہ بیداد کرے
نہ تو ناشاد نہ تاراج نہ برباد کرے

گیت سنتا ہے بڑے شوق سے چرواہا ترے
اُس کے گیتوں سے کہیں بڑھ کے سہانے، میٹھے

چوکڑی بھرتے ہیں سُن سُن کے ہرن جنگل میں
فصل طیار ہے، یہ مژدہ پہنچتا ہے اُنہیں

تو ہے سورج کا دُلارا کہ ہے ملہم اُس کا
تیری سنگیت میں کرنوں کا بجا یا بیلا

زندگی ہے تری اک نغمۂ شیریں یکسر
راحتیں سارے زمانے کی نچھاور تجھ پر

خاتمہ تجھ پہ ہے نعمت کی فراوانی کا
کیونکہ بندہ نہیں تو خواہش نفسانی کا

بوڑھا ہوتا ہے نہ جاڑے کے ستم سہتا ہے
اپنے ہی گیتوں کی لذت میں مگن رہتا ہے

خوب دل کھول کے جب تک نہیں پی چکتا ہے
نغمہ و رقص کا سیلاب کہیں رکتا ہے؟

بنتی ہے نکہت گل شوق میں بستر تیرا
(اس قدر عیش پسندی پہ ہے کتنا دانا!)

سیر ہو جاتی ہے جس وقت طبیعت تیری
ایک اشارہ تجھے کر دیتی ہے فطرت تیری

اپنی آغوش میں لیتا ہے تجھے خواب ابد
ہاتھ آتا ہے ترے گوہر خوش آب ابد!

دغا باز کیوپڈ

رات کا چھا گیا تھا سناٹا　　خوابِ راحت میں اک زمانہ تھا
ناگہاں آنکھ کھل گئی میری　　کھٹکھٹائی کسی نے یوں کنڈی

کون ہے جو کواڑ توڑتا ہے　　میرے سر پہ پہاڑ توڑتا ہے
اس اندھیری میں گھومنے والا　　باؤلا ہے کوئی کہ متوالا ہے

دل میں وسواس لائیے نہ حضور　　حال سنئے تو رحم آئے ضرور
چور، ڈاکو نہ میں اُچکّا ہوں　　ایک بے کس غریب لڑکا ہوں
سردی اور بھوک کا ستایا ہوں　　گرتا پڑتا یہاں تک آیا ہوں
چمڑی تک مینہ نے بھگوئی ہے　　پاس کملی ہے اور نہ لوئی ہے

میں نے سن کھا کے پھرتی سے اٹھا　　شمع روشن کی سوئے در لپکا

کھولا دروازہ تو نظر آیا   ایک لڑکا یہ جس کا حلیہ تھا

ہاتھ میں تو کمان شانوں پر   کانپتے تھے جو ٹھنڈ سے تھر تھر
غور سے پھر جو اک نظر ڈالی   تیروں کا پشت پر تھا ترکش بھی

پاس لایا اُسے انگیٹھی کے   ہاتھ گرمائے پھر محبّت سے
اور گیسو بھی اُس کے خشک کیے   جن سے پانی کے تھے رواں سوتے

آئی اُس طفل میں جو گرماہٹ   تو یہ کہتا ہُوا اٹھا جھٹ پٹ
دیکھوں یہ تیر تو نہیں سیلے   چھاجوں پانی تھا خوب ہی بھیگے

کہہ کے یہ زہ کمان کی اُس نے   جوڑ کر تیر پھر لگا کسنے
میری جانب وہ تیر چھوڑ دیا   دل کو چھیدا جگر کو توڑ دیا

اُڑ گیا کھلکھلا کے ہنستا ہُوا   دُور سے آئی کان میں یہ صدا
"اے مرے میزباں، خدا حافظ   زخم ہے بے نشاں، خدا حافظ!"

(قدیم یونان)

حسنِ بے پناہ

سینگ ملے بیل کو، اسپِ سبک پے کو سُم
تا کہ عدو سے بچیں اس کی یہ تدبیر کی
تیغ سے بُرّش میں تیز دانت دیے شیر کو
ننھے سے خرگوش کو تیزیٔ رفتار دی؛
طائروں کو پر ملے تا کہ ہوا میں اڑیں،
مچھلی کو خطرہ ہوا پانی کی تہہ میں چھپی
جوہرِ مردانگی مرد کو بخشے گئے
حصّہ جو عورت کا ہو شئے وہ رہی کون سی ؟
اُس کو بھلا کیا دیا فطرتِ فیّاض نے؟
حُسن دل آرام کی دل کشی و دلبری!
وار سے اُس کے بچے اتنی کسے تاب ہے
جو بھی ادا اُس کی ہے خنجرِ خوں آب ہے

(۱۹۴۲ء) ———— (دانیا کمریان)

سبھی پیتے ہیں

دھرتی پیتی ہے مینہ کا پانی
اور شجر پیتے ہیں نمی اُس کی
خود سمندر ہوا کا پیاسا ہے
اور سمندر کا چاند ماتا ہے
بندہ بھی مہربان پیتا ہے
جب کہ سارا جہان پیتا ہے

(سنہ ۱۹۴۳ء) (یونانی)

خوابِ کی تعبیر

خواب دیکھا کہ مرے پاس کھڑی ہے زہرہ
مسکراتے ہوئے اک بچّے کا ہے ہاتھ میں ہاتھ

مجھ سے بیباک ادائی سے کہی اُس نے یہ بات
"عشق" ہے، لے اسے سنگیت کے سب گُر سکھلا

تا کہ یہ گائے مرے سامنے اور میں خوش ہوں
کہہ کے یہ آنکھوں سے میری ہوئی اوجھل اکبار

سادگی تھی مری جو حکم کیا اُس کا قبول
اپنے ذمّہ لیا اُس طفل کی تعلیم کا بار

میں نے سکھلائے اُسے یاد تھے جو گیت مجھے
اور نغمات کے دیوتاؤں کا بھی حال کہا

میری تعلیم کا مطلق نہ ہوا اُس پہ اثر
بلکہ گاتا تھا مرے آگے محبّت کے گیت

اور افسانے محبّت کے کہا کرتا تھا
دیوتاؤں کے کبھی اور کبھی انسانوں کے

کئے کرتوت بیاں ماں کے بھی اپنے تو یہ
نہ رُکی اُس کی زباں اور نہ جھجکا وہ ذرا

میں نے جو اس کو سکھایا تھا وہ میں بھول گیا
اور جو اُس نے سکھایا ہے مجھے ازبر وہ ہے

(۱۹۴۲ء) (یونانی)

رزم و بزم

قدیم یونان کے مشہور شاعر اور مغنّی اینا کریان کے ایک گیت کا انگریزی ترجمہ پڑھ رہا تھا کہ اپنا ایک شعر یاد آیا ؎

"سازِ دل چھیڑ کے بھی، توڑ کے بھی دیکھ لیا
اس میں نغمہ ہی نہیں کوئی محبت کے سوا"

نظم اور شعر کے تصادم سے طبیعت میں ہیجان پیدا ہوا جس کا نتیجہ ذیل کی نظم ہے

اثرؔ

حرصِ شہرت نے یہ اک روز سجھایا مجھ کو — سُورماؤں سے ہوئے کارِ نمایاں کیا کیا
تو بھی لکھ رزمیہ فردوسی و ہومر کی طرح — رہ چکا بزم میں مستانہ غزلخواں کیا کیا

شعر کی دیوی کے مندر کا پجاری بن کر — عرض کی، جانتی ہے دل میں ہیں ارماں کیا کیا
بخش وہ گیت کہ ہر بول پہ رن بول اُٹھے — بس معاً آنے لگے ذہن میں امکاں کیا کیا

اپنے دفتر لئے شاہانِ اولوالعزم بڑھے — پیش کرنے لگے افسانے کے عنواں کیا کیا
کان سننے لگے اک شورِ مبارز طلبی — سامنے آنکھوں کے تھے جنگ کے میداں کیا کیا

میری تخئیل نے چاہا کہ ہو جولاں اُن میں
اس تگ و دو میں ہوئی خستہ و حیراں کیا کیا

سدِّ رہ ہوتا تھا ہر گام پہ عشقِ رسوا
گرچہ بچ بچ کے چلی طبعِ سخنداں کیا کیا

ذرّے ذرّے میں تھی اک عشق کی دنیا آباد
جمع تھے چاکِ جگر، چاکِ گریباں کیا کیا

لاکھ سوچا نہ کوئی راہِ مفر کی نکلی
فکرِ عالی ہوئی مغموم و پشیماں کیا کیا

ساز کے تاروں کو تب غصّے میں توڑا میں نے
کیا کہوں دل میں اُمڈتے رہے طوفاں کیا کیا
پھر نئے تار چڑھا کر اُنہیں چھیڑا میں نے
پھر نئے سر سے فراہم کئے ساماں کیا کیا

عشق کی جن میں تھی جھنکار وہ بدلے گئے تار
اب تو نکلیں گے وہی نغمے جو میں چھیڑوں گا

آؤ اسکندر و دارا سے ہو آغازِ کلام
کیا کیا، اور ہوئے کیا، یہ بتانا چاہا

مسکراتا ہوا عشق آیا، کیا جھک کے سلام
مرتعش تار ہوئے، ساز سے شعلہ نکلا

قصّے شاہانِ گزشتہ کے فراموش ہوئے
بے خودی میں جو کہا، نغمہ جانسوز بنا

کچھ نہ پایا دلِ پُرسوز میں جز درد و گداز
نرم اک آنچ تھی اور آنچ میں تپنے کا مزا

سو تمنّائیں تمنّاؤں کا منشا مفقود
دل میں اک میٹھی کسک لب پہ تبسّم ہلکا

سُورماؤں سے کہو، جائیں کہ فرصت ہی نہیں
بادشاہوں سے کہو، وقت نہیں ملنے کا

"سازِ دل چھیڑ کے بھی، توڑ کے بھی دیکھ لیا
اس میں نغمہ ہی نہیں کوئی مُحبّت کے سوا!"

ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی

حصّہ سیرِ دوزخ

کے

بابِ اوّل کا ترجمہ

باب اوّل

طے مری عمر کا جب نصف ہوا تھا حصّہ   دشتِ تاریک میں گم آپ کو میں نے پایا
جادۂ راستی و حق سے جو برگشتہ ہوا   اُس کا اظہار ہے دشوار جو کچھ پیش آیا

وحشت انگیز تھا ایسا وہ بھیانک جنگل
کہ تصوّر میں بسا ہے وہی اب تک جنگل

کم نہیں چاشنیٔ مرگ سے کچھ یاد اُس کی   نہیں آساں کہ بیاں ہو سکے رُوداد اُس کی
غم و اندوہ پہ قائم ہوئی بنیاد اُس کی   چھوڑ دے فکر بس اب اے دلِ ناشاد اُس کی

ذکر اُس کا ہو جو اُس دشت میں دیکھا میں نے
اور انجام میں جو لطف اُٹھایا میں نے

پردے غفلت کے پڑے تھے جو مری آنکھوں پر   دھیان آتا نہیں کیونکر ہوا جنگل میں گزر
ہوش منزل کا نہ تھا اور نہ جادے کی خبر   کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جاتا ہوں کدھر

گرمِ رفتار تھا اک عالمِ مدہوشی میں
طے ہوا دشتِ بلا خیز فراموشی میں

دامنِ کوہ میں تھا سر جو اٹھا کر دیکھا   تابشِ مہر سے نکھرا ہوا اُس کو پایا
مشعلِ راہ ہدایت تھی مجھے اُس کی ضیا   چونک اُٹھا اور اُسی سمت کا رُخ میں نے کیا
دردمندوں کی دُعاؤں کا اثر ہونے لگا
ظلمتِ شب سے عیاں نورِ سحر ہونے لگا

اُس شناور کی طرح سانس ہو جس کی پھولی   اور اک بار نظر آئے جھلک ساحل کی
پھر مبدل ہو خوشی میں الم مایوسی   ڈالے مڑ مڑ کے نگہ موجوں پہ جو سہمی ہوئی
گزرے آفات کے اندوہ کچھ اس طور کے تھے
کہ تصور میں بھی آثار اُسی دور کے تھے

دم میں دم آیا تو دم بھر وہیں آرام کیا   اُجڑی سنسان پہاڑی پہ میں پھر چڑھنے لگا
ہر قدم پھونک کے مضبوط جگہ رکھتا تھا   یونہی اک ڈھالواں چٹان سے نزدیک ہوا
ناگہاں بھرتی ذقن چیتے کی مادہ آئی
جانِ ناشاد پر اک آفتِ تازہ آئی

چست و چالاک غضب کی تھی، بلا کی تھی حسیں   پتلیاں زرد، سیہ جلد اگل اس میں یقیں
رخ جدھر کا میں کروں وہ بھی پہنچتی تھی وہیں   اپنی ہر سانس تھی مجھ کو نفسِ بازپسیں
متواتر یہ کیا قصد پھروں اُلٹے پاؤں
خوفِ وادی کا پکڑتا تھا مگر میرے پاؤں

وقت وہ تھا کہ سحر کو ہو عطا تازہ حیات　　ہر ستارا بنے خورشید تجلی آیات
جن کی طینت ہے وفا اور محبت ہے ذات　　حرکت بھی ہے اسی سے اور اسی سے ہے ثبات

جب کہ دل رازِ حقیقت کے بیاں کرتا ہے
چشمِ ظاہر سے نہاں جو ہے عیاں کرتا ہے

خوش وہ ہنگام کہ ہر سانس ہے وجدان کا جام　　دیدہ و دل کے لئے امن و مسرت کا پیام
اک فقط میں ہی تھا محرومِ نشاط و آرام　　مبتلائے غمِ ہستی و اسیرِ اوہام

خطرے اس طرح کے نرغے میں مجھے گھیرے تھے
کہ مرے ہوش بھی اُس وقت عدو میرے تھے

لے لو اک تازہ بلا اور بلا پر آئی　　صورت اک شیرِ ژیاں نے بھی مجھے دکھلائی
حالتِ گرسنگی میں جو مری بو پائی　　جست کی میری طرف لے کے بس اک انگڑائی

یہ گماں تھا کہ وہ آیا وہ دبوچا مجھ کو
کبھی دانتوں سے کبھی پنجوں سے نوچا مجھ کو

ایسا خونخوار تھا لرزاں تھی ہوا بھی اُس سے　　مادہ اک گرگ کی ہمراہ تھی پیچھے پیچھے
سوکھی لقات تھی اور بھوک سے جیسے کاٹھے　　لیکن آنکھیں تھیں دہکتے ہوئے دو انگارے

اُس کا مجموعہ تھی جو جس پہ مصیبت گزری
مجھ پر اس عرصے میں سو بار قیامت گزری

ڈر اسے دیکھتے ہی دل میں سمایا ایسا   دانت بجنے لگے اور ٹھنڈا پسینا آیا
اپنی حالت پہ کبیدہ ہوا میں بے سروپا   تا سرِ کوہ پہنچنے کا سہارا نہ رہا

میری جانب وہ درندے بڑھے دبکے سمٹے
رویاں رویاں مرا چیخ اٹھا کہ لپکے جھپٹے

ایسے رہرو کی طرح جو سرِ منزل پہنچے   مرحلے جھیل کے دورانِ سفر بہتیرے
شل ہوا ایسا کہ قدم آگے دھرے پیچھے پڑے   اُس کو یاس میں بدبخت بدلتے دیکھے

میں نے ناچار کیا قصد پھر اُس وادی کا
شعلۂ مہر جہاں نقش تھا بربادی کا

غار کی آڑ میں یہ سوچ رہا تھا میں ابھی   کہ یکایک نظر آئی مجھے صورت اُس کی
جس کو کہیے "ادب آموز غم خاموشی"   اپنی جانب جو پھری چشم عنایت دیکھی

عرض کی میں نے کہ کیسے کس نہ کوئی مجھ سا ہو
رحم کر رحم تو انسان ہو یا سایا ہو

"ایک کا انسان فنا مجھ میں ہوا" وہ بولا   میرے ماں باپ تھے لمبارڈ وطن منٹوا
جولیس تخت نشیں تھا کہ ہوا میں پیدا   اور آگسٹس کی حکومت میں وطن تھا روما

دیوتا میرے زمانے کے دغا باز تھے سب
دوست دشمن کے تھے اور دوست کے غماز تھے سب

ابن القیس کی تعریف میں اشعار کہے نیک عادل تھا، ٹروتین پہ کئے تھے حملے
سورما لوگ کے میدان میں اکثر مارے معرکے سر ہوئے اُن ہاتھوں سے کیسے کیسے

غلبۂ دشمن کا تھا بازکا انس جبلاتا تھا
پھر بھی نرغے سے وہ ناوہ نکل آیا تھا

آرزو کیوں ہے تجھے پھر تو پہنچ جائے وہاں ہے مصیبت کے شیاطین کا انبوہ جہاں
"کوہِ فرحت" کی طرف کیوں نہیں ہوتا ہے رواں مرکزِ عیش ہے، ہر شخص وہاں ہے شاداں

جلوہ گر ہوتا ہے وہ نورِ محبت دل سے
محو ہو جاتے ہیں سب نقش کدورت دل سے

وضع تعظیم سے تب میں نے جھکا کے سر کو عرض کی تو کہیں ورجل تو نہیں مردِ نکو
نغمہائے طرب انگیز کا مخزن تھا جو جس کا ہم پلہ یہ ممکن ہی نہیں کوئی ہو

مہر دانائی و یکتائی کی ہر بات پہ ہے
شعر و موسیقی کو خود ناز تری ذات پہ ہے

تو ہی شاہد ہے مجھے تجھ سے ہے الفت کیسی تجھ سے مانوس ہوئی میری طبیعت کیسی
شاعری سے تری حاصل ہوئی لذت کیسی ایسی نعمت ہے میسر جسے، دولت کیسی

مرحبا اے مرے استاد، ترا کیا کہنا
میں نے سیکھا ہے تجھی سے یہ انوکھا کہنا

قصد بھرنے کا درندوں کے سبب ہیں نے کیا　　فرق ہے میرے حواسوں میں نہیں ہوش بجا
تیری امداد کا محتاج ہوں مرد دانا　　نبض بھڑکی ہوئی رگ رگ میں تشنج ہے بھرا

دیکھ کر تجھ کو ہوئی لاکھ تسلّی دِل کی
پھر بھی انسان ہوں حالت نہیں اچھّی دِل کی

میری آنکھوں میں جو امڈا ہؤا دریا دیکھا　　یہ کہا اس نے بصد لطف، بدل دے رستا
آگے بڑھنے کا مصمّم ہے اگر عزم ترا　　یہ درندہ تو تجھے راہ نہیں دینے کا

جو یہاں وقت شباب آیا وہ تھا شیب زدہ
راہ پُر خوف ہے، اور جا ہے یہ آسیب زدہ

خشم فطرت ہے اگر خُبث ہے طینت اُس کی　　اشتہا کم نہیں ہوتی کسی صورت اس کی
مثل دوزخ کبھی بھرتی نہیں نیت اُس کی　　حلق تک پر ہے شکم پھر وہی حالت اس کی

کتنے ہی اور بہائم بھی مربیہ اُس کے ہیں
گو پلشت ایسے نہیں ہیں، نہ پلید ایسے ہیں

ہاتھ سے ولٹرو کے اس کی مقدّر ہے قضا　　ملک گیری کی ہوس اُس کا نہ ہو گا منشا
بلکہ تعلیم مساوات و محبت دے گا　　فلٹرو بھر میں نہ ہو گا کوئی اُس کا ہمتا

بے کس اٹلی کو مصیبت سے چھڑائے گا وہی
ایسے ویرانے کو گلزار بنائے گا وہی

اُس پہ سو جان سے دوشیزہ کمپلا تھی نثار　　پوری آئیبس نے بنایا اُسے رشکِ فرخار
دم سے پھر نیسس و ٹرنس کے ہی اس کی بہار　　بادۂ حبِ وطن سے یہ جری تھے سرشار

زندگی بسر ہوئی چھاؤں میں تلواروں کی
واہ کیا بات ہے ان اگلے وفاداروں کی

شہر و قریہ سے بھگائے گا وہ اس موذی کو　　ٹھوکروں ہی میں اُڑائے گا وہ اس موذی کو
خاک میں خوب لٹائے گا وہ اس موذی کو　　پھر پلوٹس میں سلائے گا وہ اس موذی کو

شجرِ حرص وہیں پہلے پھلا پھولا تھا
مقصدِ زیست بھی انسان وہیں بھولا تھا

بہتری ہے تری اس میں ترا رہبر میں ہوں　　جو مقامات ہیں دلچسپ تجھے دکھلاؤں
آمرے ساتھ، تجھے ایسی جگہ پہنچاؤں　　کہ جہاں گردشِ افلاک ہے اک دورِ سکوں

جو سماں دیکھیں گی آنکھیں تری نادیدہ ہے
گوشِ زد جو بھی سخن ہوگا وہ نشنیدہ ہے

سینہ کوبی ہے کہیں اور کہیں ماتم ہے　　کوئی پرساں ہے کسی کا نہ کوئی محرم ہے
اُس جگہ رُوحوں کی تکلیف کا یہ عالم ہے　　مرگِ نو کی ہے تمنا کہ وہ ہستی سم ہے

ایسے بھی کچھ ہیں توقع جنہیں جنّت کی ہے
ان کو چلنے کی ہے پروا نہ اذیّت کی ہے

مجھ سے بہتر مگر اک رُوح کی حاجت ہوگی جو مجسّم کرم و خلق و مروّت ہوگی
رہنمونی میں اُسی کی سبھی تجھے راحت ہوگی وہ ترے واسطے اک آیۂ رحمت ہوگی

سونپ دُونگا اُسے اور تجھ سے میں رخصت ہونگا
ورنہ تیرے لئے سرمایۂ زحمت ہونگا

کیونکہ اُس قادرِ مطلق کی حکومت ہے یہاں جس کے احکام سے تا زیست نا فرماں
خشمگیں ہوگا مرے ساتھ تجھے دیکھا جہاں باریابی نہ تجھے ہوگی یہ ہے میرا گماں

مطمئن رہ کہ درندوں کے نہ ہونگے حملے
اس جگہ سائے میں لے مردِ مسافر دم لے

میں نے اس سے کہا سُن شاعرِ شیریں گفتار مجھ کو تنہا نہ یہاں چھوڑ کہ ہوں غم کا شکار
ساتھ اپنے مجھے لے چل، نہیں اچھّے آثار شور و شر سے نہ دوبارہ کہیں ہو جاؤں دوچار

باب پیٹر سے معیّت میں گزر جاؤں گا
پست سے پست جو ہیں اُن کو بھی دیکھ آؤں گا

وہ چلا، ساتھ ہی سائے کی طرح میں بھی چلا وہ جو مانع نہ ہوا، خوف زدہ دل ٹھہرا
شکر صد شکر مصیبت سے ہوا چھٹکارا ہادی و رہبرِ کامل مجھے ورجل سا ملا

بعد ایذا کے میسر مجھے راحت جو ہوئی
اُس کا اظہار ہے دشوار مسرّت جو ہوئی

بشنو از نے

اک مچھیرا بیٹھا تھا ندی کے پاس — دُور تھے اس سے غم و رنج و ہراس
اور نیستاں اک قطار اندر قطار — لہلہاتا تھا ہوا میں بار بار
خشک اک نرکل مچھیرے نے چُنا — اپنے چاقو سے قلم اُس کو کیا
کر چکا جب قطع اُس کی پور پور — کھُرچا اور سوراخ ڈالے دو چھور
زور دے کر اک سِرا انچی کیا — دوسرے میں پھُونکی ہونٹوں سے ہوا
دوڑی نے میں زندگی کی لہر سی — اور گویائی میں بدلی خامشی
کیا ہوا سے خود ہوئی پیدا صدا؟ — یا کسی انسان کا نغما مجسما؟
حزن تھا لہجے میں اور فتادگی — خستگی، بےچارگی، درماندگی

"رہنے دے بس اے مچھیرے رہنے دے — آہ یہ لہرے پہ لہرے بہنے دے"
قتل کرتا ہے دوبارہ تو مجھے — چھو کے اس سختی سے اپنے ہونٹوں سے
میں تھی اک دوشیزہ نازوں کی پلی — نغمۂ نوشیں تھی میری زندگی
مر گئی ماں، باپ نے پھر شادی کی — تھے وہی دن جب سیانی میں ہوئی

جب اکیلا پاتی تھی، روتی تھی میں / آنسوؤں سے اپنا منہ دھوتی تھی میں
اور اُمڈ آتا دل طبیعت اوبتی / اپنے مرنے کی دعائیں مانگتی
کیونکہ تھی نامہرباں سوتیلی ماں / کام کرتی تازیانہ کا زباں
ساتھ لائی تھی وہ اک لڑکا جواں / مانگتی تھیں لڑکیاں جس سے اماں
ایک بھی ایسی عروسِ نو نہ تھی / جس کی اُس نے کی نہ ہو عصمت دری
دن ڈھلے ہم دونوں ندی پہ گئے / ڈوبتے سورج کی شوبھا دیکھنے
شور و غل امواج کا سنتی تھی میں / ایک محویت میں سر دھنتی تھی میں
پیش سیم و زر مجھے اُس نے کیا / اور بھی لالچ بہت دینے لگا
اس کے بدلے میں محبّت کی طلب / کیا کہوں دل پر جو کچھ گزرا تعب
آہ اُس خونخوار نے انکار پر / کر دیا پیوست خنجر تا جگر
اور میری لاش کو گاڑا وہاں / مڑ گئی ہے اک ذرا ندی جہاں
میری گھائل چھاتی سے آخر اُگی / لمبی نرکل کی قلم سوکھی ہوئی
جس میں بستے ہیں مرے رنج و الم / خون ارمانوں کا اور آنسو بہم

"رہنے دے بس اے گڈریے رہنے دے / آہ یہ لہرے پہ لہرے رہنے دے"
قتل کرتا ہے دوبارہ تو مجھے / چھو کے اس سختی سے اپنے ہونٹوں سے
رحم! کیا تو نے نہیں چکھی کبھی / زہرِ غم کی جان لیوا چاشنی؟

(سالنامہ ۱۹۴۸ء) —— (ادبی لطیف سے)

سلطانِ اجل

کون دوڑاتا ہے جنگل میں یہ گھوڑا سرپٹ؟
باپ چھاتی سے لگائے ہوئے ہے بیٹے کو	سر ہے تیوڑا ہوا اپنے پہ، گلے میں بانہیں
تاکہ سردی سے بچے گھوڑے سے گر بھی نہ سکے
"دیکھئے، دیکھئے، وہ، اُس طرف، ابّا، ابّا!"
"کیوں ہے سہما ہوا، آتا ہے نظر کیا بیٹا؟"
"آہ سُلطانِ اجل آیا مع تاج و کفن!"
نہیں فرزند، فقط ابر کا اک ٹکڑا ہے

(سلطانِ اجل کہتا ہے)

آ مرے ساتھ چل اے ننھے جھنڈولے بچے	کھیل اور کود میں دل تیرا وہاں بہلے گا
میری ماں دے گی کھلونے تجھے اچھے اچھے	پھول بھی رنگ برنگی کھلے ہیں وہاں تیرے لئے

"کیا نہیں تم نے سنا، سنتے ہو پیارے ابّا   کان میں میرے جو سلطانِ اجل کہتا تھا؟"
"چپ رہو اور خوف نہ کھاؤ میرے جگر کے ٹکڑے   تیز جھونکا تھا ہوا کا جو ادھر سے گزرا"

(سلطانِ اجل کہتا ہے)

کیا مرے ساتھ چلے گا مرے پیارے بچے   میری لڑکی بہت آرام سے رکھّے گی تجھے
گود میں تجھ کو لئے سیر کرائے گی خوب   پانی اور ٹھنڈ سے جنگل میں محافظ ہوگی
پیار کرتی رہے گی ہنس کے، گلے مل مل کے   اور سنائے گی تجھے گیت بھی میٹھے میٹھے

تم نے دیکھا نہیں، آتی تھی نظر صاف، ابّا،   بال کھولے ہوئے سلطانِ اجل کی لڑکی
مینہ میں رنگنی اس سمت سے گزری ہے ابھی
آ مری پونچھی بہت اچھی طرح دیکھا تھا   چاند کے سامنے تھی رقص کناں بید کی شاخ!

(سلطانِ اجل کہتا ہے)

چل مرے ساتھ بس اب چل کہ ہوئی دیر بہت   نہیں تو کھینچ کے لے جاؤں گا ناداں بچے!

مجھ کو مضبوط سنبھالے رہو، ابّا، ابّا　　آہ سلطانِ اجل چھینے لیے جاتا ہے
ہاتھ ٹھنڈے ہیں بہت، ہائے کلیجا ٹھٹھرا

باپ تھرّا گیا اور گھوڑے کو مہمیز کیا　　ہاتھ کا حلقہ کیا چوم کے منہ بچّے کا،
اپنے مسکن پہ وہ پہنچا یونہی لرزاں ترساں
بچہ آغوش میں اب تک تھا...... مگر مُردہ تھا

(گیٹے)　　(۱۹۴۲ء)

یاد کر لے مجھے اے بھولنے والے میرے

پیشوائی کے لئے مہر کی دوشیزۂ صبح   سجتی ہو پھولوں سے جب تنگ محل کو اپنے
شوقِ دیدار میں چہرے سے ہٹا کر گھونگھٹ   کبھی پٹ کھولے کبھی روزنِ در سے جھانکے

یاد کر لے مجھے اے بھولنے والے میرے

لیلیٰ شب لئے جب رخ پہ رو پہلا آنچل   دیکھتی سپنے کا درپن ہو بصد ناز و ادا
زلف مچلی ہو جب اک بوسۂ عارض کے لئے   کارخانہ ہو جب آنکھوں میں کھلا جادو کا

یاد کر لے مجھے اے بھولنے والے میرے

جب مسرت سے بڑھیں پینگ (یہاں آئی ہو   شفقِ شام تصور کو ترے دعوت دے
گھنے جنگل سے (جہاں دھوپ کو غش آتا ہے)   سسکیوں کی جو صدا آئے ٹھہر کر سن لے

یاد کر لے مجھے اے بھولنے والے میرے

جب ہمیشہ کو ہو خاموش دلِ خانہ خراب   اور "شوریدگیٔ عشق" بنے لوحِ مزار
اتفاقاً جو ہوا اس سمت گزرنا تیرا   روحِ بیتاب کو ممکن ہے کہ آ جائے قرار

یاد کر لے مجھے اے بھولنے والے میرے

"خوابِ آبادِ جہاں" کا یہی نقشہ دیکھا — آنکھ کھولی تھی کلی نے کہ ہوئی نذرِ خزاں
نفسِ سرد نہیں، نیم تبسم ہی سہی — اور اگر یہ بھی گراں ہے تو کر اتنا احساں

یاد کر لے مجھے اے بھولنے والے میرے

موت گو بیچ میں ہم دونوں کے حائل ہوگی — سجدے کرتی رہے گی روح مری در پہ ترے
رات کا ہوگا شباب اور ستاروں کا سنگار — کیا عجب درد میں ڈوبی یہی آواز آئے

یاد کر لے مجھے اے بھولنے والے میرے

(۱۹۳۷ء) — (فرانسیسی)

تلخابۂ نوشیں

ہٹالے

مرے ہونٹوں سے ہونٹ اپنے ہٹالے

جھکالے

نشیلی نگاہیں جھکالے

مری رُوح تحلیل ہونے لگی ہے رگیں کھنچتی ہیں جسم میں سنسنی ہے

سنبھلنا نہیں ڈوبتا دل سنبھالے

ہٹالے

بس اب طاقتِ ضبط باقی نہیں ہے کہیں میں ہوں اور جانِ مضطر کہیں ہے

نہ کر خوابِ نوشیں کے مجھ کو حوالے

ہٹالے

ادھر موت کا چھا رہا ہے دھندلکا اُدھر ایک سنسان دھندلی سی دنیا

محبّت کے جس میں ہیں آئین نرالے

ہٹالے

لبِ آبِ جو سبزہ زار و خیاباں جہاں مردہ مطرب کا سایہ ہے لرزاں

نوا سنجیاں اور نہ دلدوز نالے

ہٹالے

محبّت تھی جس سے وہ عورت بغل میں یہ اک شائبہ زندگی کا اجل میں

جہاں دل دھڑکتے تھے مرجھائے چھالے

ہٹالے

نہ آنکھوں میں رونق نہ تابندگی ہے رخِ زرد ہے اور افسردگی ہے

کہاں اب وہ ارمان نازوں کے پالے

ہٹالے

وہ پیڑا سے ہونٹوں پہ وہم تبسّم تکلّم کی حسرت بجائے تکلّم

یہی حال میرا بھی ہوگا بچالے

ہٹالے

مرے ہونٹوں سے ہونٹ اپنے ہٹالے جھکالے نشیلی نگاہیں جھکالے

(فرانسیسی) (دسمبر ۱۹۴۲ء)

باغی انسان

چہچہاتا دل کے مل مل کر   اور سناتیں ہوا میں ہل ہل کر
نو بنو نغمے پیش کرتے تھے   نغمے تھے یا شراب کے جرعے

زیرِ گلبن تھا میں نشاط میں غرق   سارا گلشن تھا انبساط میں غرق
تھی وہ حالت دلِ گداختہ کی   جب خیالات عشرت آگیں بھی
ساتھ لاتے ہیں جذبۂ آلام   اک خلش، ایک لذتِ بے نام

مستحق پا کے محرمی کا مجھے   اپنی رعنائیوں سے فطرت نے
کر کے وابستہ شرح کو میری   جو حقیقت تھی آئنہ کر دی
سخت نادم ہوا، ملول ہوا   چشمِ باطن سے میں نے جب دیکھا
آدمی ہو گیا ہے کیا سے کیا
آفرینش کا بھول کر منشا

کنج پر مالتی کے پھولوں سے — جہاں پھیلے ہوئے تھے خوشبو کے
پیالے پیارے وہ چاند سے مکھڑے — بلکہ یہ کہیئے، چاند کے ٹکڑے!
اُن کو چھو لیجئے تو میلے ہوں — نازک اندام ہوں تو ایسے ہوں
میں ہوں شاعر مرا عقیدا ہے — دل گواہی بھی اس کی دیتا ہے
پھول خوش ہوتے ہیں مہکا کر — کھول دیتے ہیں گو وہ شرما کر

سینے پر چٹکیاں بھرتی تھیں چڑیاں — لڑتی اور گتھ کے گرتی تھیں چڑیاں
میل ابھی ہے، ابھی لڑائی ہے — اور اسی وقت پھر صفائی ہے
کھلے بندوں ہیں پھر ملاقاتیں — پھر وہی چاہ پیار کی باتیں
سادگی میں ڈھٹائیاں اُن کی — اُف وہ کافر ادائیاں اُنکی
دل میں کیا کیا تھے چاؤ کیا معلوم — لیکن اتنا تو کھل گیا مفہوم
اُن کی ہر اک خفیف جنبش بھی — میری رگ رگ میں کیف بھرتی تھی

پنکھیاں کونپلوں کے ہات میں تھیں — یہ نسیم سحر کی گھات میں تھیں
دیکھئے ان کو، فریفتہ ہو جائیے — بانہیں گردن میں ڈالے اور سو جائیے
کوئی کچھ بھی کہے، مجھے ہے یقیں — اُن کے دل میں بھی اُمنگیں تھیں

اگر اس قول میں صداقت ہے   اور معصوم و سادہ فطرت ہے
حق بجانب ہے پھر جو میں محزوں   کر کے فریاد بار بار کہوں
"آدمی ہو گیا ہے کیا سے کیا،
آفرینش کا بھول کر منشا"

(۱۹۴۲ء)   (ورڈز ورتھ)

تھار

میں ہوں "خدا" جنگ کا "تھار" مرا نام ہے — کہتے ہیں جس کو قضا وہ مرا پیغام ہے
شرق سے ہے غرب تک سب پہ حکومت مری — جنگ مرا مشغلہ صبح سے تا شام ہے
دھاک وہ میری بندھی قومیں ہیں تابع مری — لطف مرا خاص ہے، قہر مرا عام ہے
دہر میں کوئی نہیں میرا حریفِ نبرد — آب مرے خوف سے زہرۂ ضرغام ہے

گرز مرا "جولنر" دیو کا سر توڑ دے
گاوِ زمیں ضرب سے جس کی جگہ چھوڑ دے

پنجۂ فولاد سے گرزِ گراں تھام کر — پھینکتا ہوں دور میں تے کے کماں گرد ہر
یہ ہے کمر پیچ وہ جس سے ہو طاقت دو چند — یہ ہے وہ چار آئنہ جس پہ نہ ٹھہرے نظر
جس کے علم ہوتے ہی آگ برسنے لگے — تیغ وہ خارا شگاف رکھتا ہوں بے خطر
کوندا لپکتا نہیں چرخ پہ یہ بار بار — جمع ہوئے ہیں وہاں اس کے ہی اُڑ کر شرر

دوشِ ہوا پر جنہیں ملکۂ شب لے گئی
تاکہ نہ ایمن رہے میرے غضب سے کوئی

رعد مرا بھائی ہے، آنکھیں مری بجلیاں — قہر سے ڈپٹا جدھر، اٹھنے لگا بس دھواں
کھینچتے ہیں جب ابر میں بھٹے مری کھچی کے — ہوتی ہے پیدا گرج، کانپتے ہیں آسماں
میں جو رجز خواں ہوا زلزلے آنے لگے — کوہ و زمیں شق ہوئے پھٹ پڑے اونچے مکاں

کون جگہ ہے جہاں تہلکہ برپا نہیں
حشر کا سا ہے سماں، کوئی کسی کا نہیں

اب بھی جہاں میں ہے دور زور کا اور تیغ کا — ہوگا وہ آئندہ بھی جیسا اسلاف میں ہوا
علم جسے کہتے ہیں ضعف کی ہے وہ دلیل — دیکھ لو ہر عہد میں غلبہ طاقت رہا
علم و ہنر ہیچ ہیں جب نہیں بازو قوی — کوڑیوں کے مول بھی کوئی نہیں پوچھتا

شور زمانے میں ہے تیغ شرربار کا
حلقہ بگوش اک جہاں آج بھی ہے تلوار کا

(لانگ فیلو)

آخری وصیّت

یاد کرنا بچھڑ کے جب تم سے
ہم بسائیں گے شہر خاموشاں
دور بستی سے کالے کوسوں دور
کوئی پرساں نہیں کسی کا جہاں

یاد کرنا وہ وقت پیارے سے جب
تم مرے ہاتھ کو دباتے تھے
اور تھا شرم سے یہ حال مرا
پاؤں تھراتے لڑکھڑاتے تھے

پھیر کر منہ کو جانا چاہتی تھی
پر نہ اُٹھ سکتے تھے قدم میرے
دیکھ کر تم پسینے میں مجھ کو
آپ ہی تم ہاتھ چھوڑ دیتے تھے

یاد کرنا وہ وقت جب ہر روز
سوچا کرتے تھے ہم ہم کیا کیا
آہ بس یاد ہی کیا کرنا
وقت ہوگا دعا نہ مشورے کا

بھول جاؤ کبھی جو بھولے سے — اور پھر اُس کے بعد یاد کرو
رنج کرنا نہ میری جاں کی قسم — روح خوش ہوگی جب ہیں تم خوش باش

کیونکہ تاریکی و فنا نے اگر — شائبہ بھی خیال کا چھوڑا
یہ تصوّر رہ پائے گا چھپ کر یاں — دشمنوں کو ہے غم جدائی کا

سن لو یہ آخری وصیّت ہے — ٹھنڈی سانسیں بہت نہ بھرنا تم
کر لو وعدہ اگر محبّت ہے — یاد تو کرنا غم نہ کرنا تم

(کرسٹینا روزیٹی)

نثر اور شاعری کا فرق

خبر ہے شرط ہم نوا
خرد ہو یا ہو راستی
یہ دونوں کائنات ہیں
ہر ایک اچھی نثر کی
مگر لبوں پہ راستی کے جس سے ہے شگفتگی
گلاب ہے وہ شاعری
اگرچہ شاعری نہیں ہے اتنی

خرد کی آنکھ میں بھی ہے
اسی کی تیز روشنی
خرد سے گو علیحدہ اک اور شے ہے شاعری

خرد ہو یا ہو راستی
خرد نہیں ہے شاعری
نہ راستی ہے شاعری
مگر اسی کی وجہ سے یہ حسن راستی میں ہے
خرد میں آب و تاب ہے
خیر ہے شرط ہم نوا!

(انگریزی سے)

مزدور

دل رانگ رانگاں شدہ نہیں کچھ اپنے حال کی
تصویر اک دُکھے ہوئے حسنِ وملال کی
ہے صبح اُس کی صبح نہ شام اُس کی شام ہے
اس بدنصیب شخص کا مزدور نام ہے

(آثر)

(۱)

صدیوں کے بوجھ سے ہے سر اُس کا جھکا ہوا! اپنی کدال کا ہے سہارا لئے ہوئے
افسردہ دل ہے سوچ میں کھویا ہوا سا ہے کیا سوچتا ہے؟ کیوں ہے زمیں کی طرف نظر؟
قرنوں کا کھوکھلا "الم" آنکھوں سے آشکار جس پر زمانے بھر کے مصائب کا ہے ہجوم
اپنی امید و یاس کا مرقد جو آپ ہے جس کو خوشی سے کام، نہ حرماں کا امتیاز
تیورا گیا ہو چوٹ کوئی کھا کے جس طرح "لادی کا بیل" جیسے ہو، اللہ ری بے حسی!
یہ کس نے اُس کے جبڑوں کا ڈھیلا کیا تناؤ کیوں ربط اُٹھ گیا ہے لبوں کا ہنسی کے ساتھ
یہ کس کے ہتھکنڈے ہیں کہ ماتھا پچک گیا گل کر دیا چراغِ خرد کس کی سانس نے

(۲)

کیا یہ وہی بشر ہے خدا کو جو تھا عزیز بھیجا تھا بحر و بر پہ حکومت کے واسطے
تاروں سے راز چھینے، افلاک سے وسعت لے طاقت کی انتہا تھی نہ کچھ دبدبے کی حد
ہر لمحہ جس کو فرحتِ عیشِ دوام تھا جس کی بندھی تھی دھاک سمک سے سما تلک
سورج بنائے جس نے اور اُن کو رواں کیا یہ اُس کا خواب؟ جس کے وہ دلچسپ خواب ہیں
دوزخ کی ہولناک خلیجوں میں بھی نہیں عفریت کوئی اس کے جو لگ بھگ ہیبت میں ہو
اہلِ جہاں کی اندھی ہوس کی "زبوں" زباں مہلک نشانیوں کا "پلندہ" برائے روح
مخدوش اس قدر ہو جو عالم کے واسطے پیغامِ صد ہلاکت و بربادی و فساد

محسود تھا فرشتوں کا اک دن یہی بشر (۳) کتنا نیاپن اس میں فرشتوں میں آج ہے

زنجیر میں غلامی کی جکڑا ہوا ہے یہ
محنت کی "رتھ" سے پاؤں ہے اس کا بندھا ہوا

کیا جانے یہ مبادیٔ تعلیم و فلسفہ
سمبندھ کیا ہے راگوں کا اور کیا الاپ ہے

پو پھٹنا کس کو کہتے ہیں کیا ہے سحر میں سحر
کس طرح سُرخ ہوتا ہے چہرہ گلاب کا

اس مسخ اور ڈراؤنے "راکشش" کی آڑ سے
صدیاں اور ان کے تیرہ مصائب ہیں جھانکتے

وہ کبڑی پیٹھ اور وہ بھٹکی ہوئی رگیں
کیا کیا سلوک اس سے کئے ہیں زمانے نے

اس پیکرِ "درشت" پہ تکیہ کئے ہوئے
انسانیت حرارت سے محروم ہو گئی

اُن طاقتوں سے کرنی ہے فریاد متصل
لائی ہیں جو وجود میں ایسے جہان کو

جس میں اُڑایا جاتا ہے انساں کا مضحکہ
اور کچلے پیسے جانے کا ٹھہرا ہے مستحق

جس کو دھکیلیں قعرِ ذلت میں لوٹ کر
مضمر اس احتجاج میں ہے پیشگوئی بھی

(۴)

اے خواجگانِ خلق و خداوندگانِ دہر
یہ تحفہ لے چلو ہو خدا کے حضور تم!

یہ بگڑی شکل جو ہے "عطش زار" جسم و رُوح
تم اس کے خم نکالو گے کس طرح، کچھ بتاؤ

بخشو گے کس طرح اسے لافانیت، کہو!
لافانیت کہ حق تھا کبھی اُس کی رُوح کا

آنکھوں کو اُس کی دو گے چمک، قد کو راستی
موسیقیت کا لوچ بھی اور خوشگوار خواب؟

ہو گی تلافی کہنہ بداعمالیوں کی کچھ؟
دھوکے دھڑی کی، رنج و مصیبت کی جبر کی؟

(۵)

اے خواجگانِ خلق و خداوندگانِ دہر — کس طرح پیش پاؤگے، تدبیر سوچ لی؟
کیا ہے جواب اس کے بھی سوال کا — جس وقت انقلاب کی آئیں گی آندھیاں
جب تہلکے میں ہوں گے زمین و مکاں تمام — کیا حشر ہوگا مملکت و شہریار کا
اُن کا کہ "ایسے دیو" کے خلّاق جو ہوئے — اُس کے سپرد کرنے کو قسمت کا فیصلہ

یہ گونگا "قہر" اُٹھے گا جب احتساب کو
اک چیخ بن کے گونجے گی صدیوں کی خامشی

(۱۹۴۱ء) (ترجمہ)

کسان

جھٹپٹا وقت ہے، چھائی ہوئی خاموشی ہے
ایک شخص اور اُسے گھیرے ہوئے چار طرف
کچھ زمیں توڑی ہوئی، کچھ دلِ بے رحم سی سخت

اُس کے نزدیک ہیں دو گھوڑے وہیں اک ہل بھی
..... تو یہاں کم کو سدھاتا ہے، بناتا ہے ہل
اور کھیتی کے لئے کرتا ہے طیّار زمیں

کچھ سنا، فاصلہ قرنوں کا ہے حائل ہم میں
کیا دعا مانگتا ہے شام کی تنہائی میں
سر جھکائے ہوئے، خاموش، نظر سوئے زمیں؛
کیا ہوا ہے جو حماقت سے بھرا تیرا جواب

کم ہوا قیدِ مشقت سے تری اور اک دن
شب کے بخشندہ خدا کا تجھے لازم ہے سپاس

پھیلتی جاتی ہے اندھیاری جو دھیرے دھیرے
بہتر اور جیتی زمین ایک ہوئی جاتی ہے
ہے بہا لُم کے قریب اُن کا سُدھانے والا
اُن سے اُونچا ہے سر اُس کا فقط اک دو مٹھی
ایک دو مٹھی فقط؛ ہاں مگر اتنے ہی ہیں
دفن دوزخ کی ہیں گہرائیاں پستی میں اِدھر
تو اُدھر رفعتیں فردوس سے ہیں دوش بدوش
بلکہ دیوتاؤں کے ایوان سنگھاسن لیوان
اور پاسنگ ہیں رتھ، دبدبہ، زرتار لباس

(ترجمہ۔ پیٹرک کولم) (۱۹۴۳ء)

خدائے نامعلوم

شام کی وہ دھندلی دھندلی روشنی — پھیکی پھیکی میلی میلی ہاں بجھتی،
اُس سے بالا اور بہت بالا کہیں — ایک نورانی محیطِ بیکراں
بھاپ اور شعلے کے ایسے تلملے — یا ستارے چھوٹے چھوٹے جھلملے
جیسے پر پروانۂ سوزاں کے ہوں — یا پگھلتے شیشے کے پرکالے ہوں
اور کناروں پہ رقصاں روشنی — اپنے سائے سے گریزاں روشنی
وہ ستاروں پر ستاروں کا ظہور — نور پر ہو ضوفگن جس طرح نور

ہم نہ سمجھے روشنی بڑھتی گئی — عشرتِ نظارگی بڑھتی گئی
اس قدر محوِ تماشا تھے خموش — کچھ نہ تھا اپنے سراپا کا بھی ہوش
اور دل سرشار ایسے حسن سے — جو نہیں ہے چشمِ ظاہر کے لئے
جس کو آنکھیں دیکھ سکتی ہی نہیں
آستاں کی خاک سے ہے جبہ سا

(ترجمہ۔ ڈبلیو بی ییٹس)

(سنہ ۱۹۴۲ء)

عشق کا بول بالا

عشق ہے اور اک مصائب کا ہجوم پھر بھی ہے رشک و حسد سے پاک و صاف
جس میں شامل نہیں ذوقِ نمود خود نگر، خود دار، بے لاف و گزاف

حرفِ نازیبا کہ فعلِ ناروا، اس سے ہو سرزد، یہ ہے امرِ محال
اپنے نفع و سود پر رکھے نظر یا برا چیتے کسی کا کیا مجال

جھوٹ کا حامی کبھی ہوتا نہیں راستی ہے وجہِ دلشادی اُسے
اور ہے خود اعتمادی کا یہ حال قید ہے تمہیدِ آزادی اُسے

رشتہ ہے امید سے باندھے ہوئے سخت جیسا مرحلہ بھی پیش آئے
گامزن ہے اپنی منزل کی طرف دھن کا پکا، موت پر جو فتح پائے

(سنہ ۱۹۴۲ء) (انگریزی)

گیت

۱

تمہارے چہرے کو گھیرے ہیں خواب کے چہرے ‏— کہ ایک شاخ میں جیسے کئی شگوفے ہوں
تمہارے چاند کے حلقے میں ہوں لئے ایسے ‏— جو اختلاف کے با وصف ملتے جلتے ہوں

نظر کے ساتھ دھڑکتے دلوں کی بھی آواز ‏— گزشتہ نسلوں سے آتی ہے میرے کانوں میں
وہی ہے نغمۂ شیریں وہی ہے دل کا نشہ ‏— طیور اب بھی نوا زن ہیں آشیانوں میں

یہ اُن سے کہتا ہوں میں، تھے تمہارے نخلِ حیات ‏— کھلے تھے جن میں یہ رنگین پیارے پیارے پھول
تمہارے جوشِ پرستش سے ہے قرار و ثبات ‏— تمہارے پھول جو تھے اب ہیں ہمارے پھول

۲

نچھاور اُن پہ انہوں نے کئے پریم کے پھول ‏— گزشتہ عہد میں، تازہ ہے جس کی یاد ابھی
وہی اصول ہے میرا بھی جو تھا اُن کا اصول ‏— وفا و مہر میں باہم ہے اتحاد ابھی

زمانہ کتنے ہی پہلو بدل چکا جب سے　　　وہی ہے رنگ محبت وہی ہے دورِ حیات
حقیقتوں میں تغیر نہیں ہوا جب سے　　　وہی ہے تابشِ انوار و بارشِ برکات

وہی ہے حسن و محبت کی گرم بازاری　　　وہی ہیں آج بھی رنگینیاں گلستاں کی
وہی ہے بادہ، وہی ہے خودی و سرشاری　　　میں تم سے کرتا ہوں تجدید ان کے پیماں کی

(۱۹۴۲ء)　　　(ترجمہ اے ای)

یاد اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے

اُف انوکھی وہ سجاوٹ وہ انیلی چتون — چمپئی رنگ پہ جوبن کی وہ بلندی کی پھبن
کِھل گیا جیسے چمن یہ تھا ہنسی کا نقشہ — تازہ اک پھول کنول کا تھا شگفتہ چہرہ
بسترِ ناز سے اٹھنے پہ یہ تھا جس کا حال — چھوٹی موتی کی طرح دردِ جدائی سے نڈھال

یاد اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

جیسے پیغامِ سحر پر کوئی نرگس کی کلی — مسکراتی ہے کبھی اور لجاتی ہے کبھی
یہی آن انکھڑیوں کا نیند میں نقشہ دیکھا — خوابِ رنگیں کے تصوّر کا کرشمہ دیکھا

یاد اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

دیکھ کر آئینے میں اُس کی ادائیں گیسو — رُخ پہ جھک پڑتے تھے لینے کو بلائیں گیسو
وہ جوانی کہ نثار اُس پہ لپٹ پھولوں کی — مشک و صندل کی مہک جسکے پسینے میں بھی
پلکیں اُن آنکھوں پہ یوں سایہ فگن تھیں، گویا — عشق نے حسن کو آغوش میں لینا چاہا

یاد اُس جانِ تمنّا کی رُلاتی ہے مجھے

وصل کے بعد یہ تھا شرم سے اُس کا عالم — سُرخی آنکھوں کی نہ تھی خونِ لبِ نیسے کم

اور کندن سے دمکتے ہوئے چہرے پہ عرق — گل کے رخسار پہ غازہ ملے جس طرح شفق
یوں تھی اک بوند پسینے کی لب نازک پر — جھلملاتا ہو ستارا کوئی ہنگامِ سحر

یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

لاکھ بیتاب تھے کھل جائے تبسم کے لئے — غنچے منہ کھول نہ سکتے تھے تکلم کے لئے
شاخ مرجاں سے بھی نازک وہ کلائی اُس کی — دانت وہ جن سے کہ بے آب ہو موتی کی لڑی
چال وہ ہنس کی جو چال کو بھولے کہیں اڑ جائے — وہ قدم یوں جو چلے بادِ سحر غش آ جائے

یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

آہ وہ وقت کہ وہ شوق کے آغوش میں تھی — گو اندھیرے میں نظر آتی نہ تھی شکل اُس کی
جوت میں رتنوں کی ناگاہ ہوئیں جاگ پڑیں آنکھیں — مسکرائی ذرا اور پھیر لیں اک بار آنکھیں
شرم آلود تبسم کو بھلاؤں کیونکر — ایسے خاموش ترنم کو بھلاؤں کیونکر

یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

بھولی صورت پہ غضب اُس کا وہ اندازِ حیا — جس سے مدہوش ہو عالم وہ شرابِ اُس کا شباب
جیتے جی اُس کو جو پھر ایک نظر دیکھ سکوں — عیشِ لافانیٔ فردوس کو قربان کروں

یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

کیوں کٹھن ہو نہ مجھے زیست کا اک اک لمحہ — دور جب اُس سے رہوں لطف نہیں جینے کا
کاٹ دے کاٹ دے اے موت گلے کا پھندا — صبرِ جاوید و سکونِ ابدی کر کے عطا

یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

(سنسکرت سے)

سرودِ وجود

نیستی کا تھا وجود اور نہ ہستی کا وجود — نہ ہوا کا تھا نشاں اور نہ یہ چرخِ کبود
نہ ہویدا تھا نہ پنہاں، نہ زماں تھا نہ مکاں — نہ محیط اور نہ اُس کا عمق نامحدود

موت نایاب تھی معدوم تھی اُس وقت حیات — رات اور دن نہ تغیر نہ تسلسل نہ قیود
ایک دھڑکن تھی جو تھی چار طرف چھائی ہوئی — وجہ تحریک فقط جوش خود اُس میں موجود
اُس سے باہر کوئی شے تھی نہ زواں اور نہ دوام — نہ بلندی تھی نہ پستی نہ ورود اور نہ صعود

ایک ظلمت تھی جو چھائی ہوئی تھی ظلمت پہ — جادہ و میل نشاں منزل و رہرو مفقود
اس خلا میں حرکت سے ہوئی حدت پیدا — اور حدت سے ہوا جسم کا بکھرا تار و پود
ناگہاں بحر میں اک "موجِ ارادہ" اُٹھی — جو ہے نطق و تخیّل سے تجلی آلود
رہنمونی میں تعقل کی خردمندوں پہ — یہ کھلا بود کا رشتہ ہے بدستِ نابود

روشنی گرمیٔ اندیشہ سے ظلمت میں ہوئی — "وہ جو ہے" نور کہ ظلمت میں کہاں ہے موجود
قوتِ فکر وہی جذبۂ تخلیق وہی — ہمہ جولانی و سرگرمی و دلبستِ کشود

عقل عاجز ہے کہ "وہ" کیا ہے کہاں ہے کیوں ہے — "ہستی" کیونکر وہ ہوا اور ہے کیا وجہِ نمود
دیوتا خلق ہوئے ارض کی تخلیق کے بعد — کون ہے پھر جو کرے منکشف اسرارِ وجود

(۱۹۴۳ء) — (از رگ وید)

وقت

وقت کی بنیاد پر دہر کی تعمیر ہے　　خواب ہے سارا جہاں اور یہ تعبیر ہے
اس کی ہی آغوش میں سونا ہے پھر ایک بار　　اس کے سوا اور کچھ شرح نہ تفسیر ہے

جب سے ہم آئے یہاں، قافلہ بھی ہے رواں　　اس کی خبر کچھ نہیں کس کی ہے منزل کہاں
جانتے ہیں اس قدر سب کو ہے جانا ضرور　　وقت حدی خواں بھی ہے، وقت ہی میل نشاں

جیسے ہوا میں جھکیں پودوں کے سر بار بار　　وقت کا فرماں کوئی ٹالے نہیں اختیار
اس کے اشارے پہ جب ہوتی ہیں خم گردنیں　　مرنے کہ جینے پہ کیوں روئیے پھر زار زار

(سنہ ۱۹۴۳ء)　　(بھرتری ہری)

جاہل کی تربیت

تم ریت کو خوب اگر نچوڑتے جاؤ　　ممکن ہے کہ تیل اُس سے نکل ہی آئے
یا دشت میں اک پیاس کا مارا رہرو　　موجوں میں سراب کی بھی پانی پائے

ممکن ہے اسی طرح ہانگ و دو کے بعد　　خرگوش وہ مل جائے کہ ہوں جس کے سینگ
لیکن کرو تم لاکھ جتن یہ ہے محال　　سمجھانے سے جاہل کرے ترک اپنی ڈینگ

(سنہ ۱۹۴۲ء)　　(بھرتری ہری)

چوری

چاندنی چھاؤنی چھپائے تھی اُدھر گلشن میں   محوِ گلگشت اُدھر رشکِ قمر گلشن میں
"کنج میں کیجیے آرام" نزاکت نے کہا   بچھ گئے چار طرف دامِ نظر گلشن میں

ناز سے اُس نے اُدھر بندِ قبا کھول دیئے
اور غنچوں نے ادھر دستِ دعا کھول دیئے

دل سے مجبور تھا، جھانکا..... تو بھلا کیا دیکھا   ایک نازک سی کرن کا یہ تماشا دیکھا
دبکی دبکی بڑھی، عارض کی بلائیں لے لیں   لعل لب چوم لیے، نہ وہ چونکی، سلیقہ دیکھا؟

چپکے سے اڑ گئی وہ رقص کناں سوئے فلک
مجھ پہ لے دے ہے نہیں جاتا گماں سوئے فلک

(۱۹۴۳ء)   (بحر نزی ہری)

کام

کام یہ پورا ہوا اور یہ ادھورا ہے ابھی
اور فلاں کی ابتدا لازم ہے اسکے بعد ہی
تھے ابھی الجھے ہوئے ان دھندوں میں نادان غریب
موت نے ناگاہ چنگل میں دبوچا، یا نصیب

آج کا دن ہے ترا، کر لے جو کچھ ارمان ہے
آنکھ جھپکی اک ذرا اور کوچ کا سامان ہے
اور کچھ ہو یا نہ ہو اس جانفشانی کا مآل
سانس ٹوٹے کام چھوٹا، دیگا تسکیں یہ خیال

(۱۹۴۲ء) (بھرتری ہری)

چندرائی!

"درخت اشوک کے بیکار ہے ترا انکار"

دہکتی آگ چتا کی ہے یا تری شاخیں   خبر بھی ہے تجھے کمھلا گئیں ہری شاخیں
یقین آئے گا کس کو کہ تو نہیں شیدا   کہیں چھپائے سے چھپتا ہے رازِ اُلفت کا
چھلے گی مجھ سے نہ ہرگز یہ تیری چندرائی   نہ ہوتا عشق تو ہوتا یہ رنگِ رعنائی
بہانے چھوڑ، بتا ہے کہاں وہ جانِ بہار   بہار اُسی سے ہے ورنہ کہاں یہ شانِ بہار
اِدھر ہی آئی ہے ہاں ہاں ضرور آئی ہے   یہ آگ تفرقہ کی تیری ہی لگائی ہے

"درخت اشوک کے بیکار ہے ترا انکار"

نسیم ہے تری شاہد کہ تو نہیں واقف   نہ اُس سے تو ہے نہ تجھ سے وہ نازنیں واقف
یہ ٹھنڈی سانسیں یوں ہیں بھر رہا ہے تو گویا   میں ہی تو دیدۂ شبنم سے رات بھر رویا
وہ پھول باغ جدائی کا، جانِ محبوبی   مہ دو ہفتہ مقابل میں داغ محجوبی
ملی نہ ہوتی جو تجھ سے تو کیا یہ چمکن بھتا   مری ہی طرح نہ تو خاک چھانتا پھرتا
لچکتیں شاخیں اس اندازِ دلربائی سے   اسے پناہ ترے دیدے کی صفائی سے

"درخت اشوک کے بیکار ہے ترا انکار"

(۱۹۴۲ء)   (بھرتری ہری)

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کرو گی مجھکو

دارِ فانی سے جہاں داغ لیے میں اٹھا — یاد آؤں گا بہت، دھیان رہے بس اتنا
دلِ پشیماں ستم، آنکھوں میں تصویرِ وفا — کام ہوگا نہ کوئی اور تمہیں اس کے سوا
پوچھو گی شام کے تارے سے کبھی میرا پتا — موجِ ساحل سے کہو گی کہ ہو دیکھا تو بتا
وحشت کا جس میں تپش دفن ہے) ایک اک ذرہ — نقش بن جائے گا میرے ہی دھڑکتے دل کا
دو گی جا جا کے فلک بوس پہاڑوں میں صدا — دیں گے آواز پہ آواز، مگر حاصل کیا
گنگناتی ہوئی گزرے گی اگر بادِ صبا — رک کر پوچھو گی کچھ تو ہی پتا دیتی جا
یاس میں لب پہ مکرر یہ سخن آئے گا — کیا ہوا، کیا ہوا، وہ چاہنے والا میرا

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کرو گی مجھکو

خواب سے چونکو گی، کہتی ہوئی، آیا کوئی! — لے کے آہستہ مرا نام پکارا کوئی
دلِ بیتاب پہ اک سایہ سا لرزا کوئی — دیکھوں کس طرح کہ ہے محوِ تماشا کوئی
مسکراتا ہوا آغوش میں لے گا کوئی — جانِ مشتاق نہ رہ جائے تمنا کوئی
، نا بستر کے گا اب ہے نہ جب تنہا کوئی — آ کے سپنے میں ستاتا ہے ستایا کوئی

دل یہ بھر آئے گا پھوٹے کہیں سوتا کوئی — اشک میں اُمڈ آئینگے جو جوش میں دریا کوئی

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

ٹوٹ جائے گا یکایک جو کوئی تارِ رباب — سب کہینگے اُسی بدبخت کے ہے دل کا جواب

یاد آجائے گا تم کو کوئی بھولا ہوا خواب — نغمۂ ورطرب ، ولولۂ عہدِ شباب

صحبتیں جن کا ہر اک لمحہ تھا ہم رنگِ شباب — کیف میں ڈوبی ہوئی حیف مگر برق شتاب

داستاں ہجر کی بن جائیگا ہر اشکِ خوش آب — کوئی حسرت کا مرقع کوئی حرماں کی کتاب

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

زیرِ دیوار چھپا لے گی چمیلی چادر — گوندھنے بیٹھو گی تم پھولوں کا نازک زیور

ہاتھ یوں کانپیں گے اس وقت تمہارے تھر تھر — ڈر سمائے گا نہ ہوں چوڑیاں ٹھنڈی ، لڑ کر

اور گماں ہوگا یہ مرجھائی ہوئی کلیوں پر — کوئی ہے آہ بلب اور کوئی خاک بسر

ہوگا محسوس تمہیں گور کا میری منظر — جس کا ہر ذرہ ہے اک نالۂ محروم اثر

برگِ آشفتۂ گل قطرۂ شبنم سے تر — ہے بہت ، آئے جو ہمراہ صبا وقت سحر

یہ تصور کبھی بندھ جائیگا جب تجھ پہ پہر — تپشِ ہجر سے لو دے اُٹھے گا تارِ نظر

اور اس تار میں پھول اشکوں کے خود بندھ بندھ کر — دیں گے پژمردہ تبسم پہ نچھاور کی خبر

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

مے بدوش آئے گی جس وقت ہوا ساون کی — مست و سرشار جوانی سے بپے سرگوشی

آسماں ہوگا یہی اور زمیں ہوگی یہی — منزلِ مرگ کا ہونگا فقط اک میں سفری

یاد آئے گی تمہیں تنگئ آغوش مری — اپنی ہی باہوں کو تم آپ یہ دعوت دوگی

ہوگی خواہش کہ ہو بوسوں کی تمنا پوری — مستحق جس کی تھی اک دن مری شوریدہ سری

ہونٹ تھرائینگے ہنسنے میں بناوٹ کی ہنسی — میٹھی چٹکی سینے گی سیج کی ایک ایک کلی

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کروگی مجھکو

موجیں گنگا کی وہ منہ کھولے ہوئے مثلِ نہنگ — کرتی تھیں ناؤ سے اٹکھیلیاں بے ننگ و درنگ

رات اور ناؤ میں ہم ہر صلح کبھی اور کبھی جنگ — گھُپ اندھیرے میں فقط ہم کی روشن مردنگ

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کروگی مجھکو

زر فشاں چاندنی سے بامِ فلک جب ہوگا — سازِ انجم پہ مرے نغموں کی گونجے گی صدا

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں پہ یہ ہوگا دھوکا — ڈوبتا کوئی ستارا ہے کسی کا جد یا

میں نہ ہونگا تو بہت یاد کروگی مجھکو

رقص کرتا ہوا لپکے گا بھیانک طوفاں — برق اوپر قہقہہ زن رعد اُوپر نعرہ کناں

شور وہ تند ہواؤں کا وہ باد و باراں — جیسے زنجیر تڑاتا ہو کوئی پیلِ دماں

وہ دڑیڑے وہ تھپیڑے کہ بس اللہ کی اماں — جھولا جھولے گی اٹاری وہ قیامت کا سماں

اُس پہ وہ رات اندھیری کہ گھٹے جیسے ہول — واہمہ شکلوں سے آباد کرے گا یہ جہاں

منہ سے اک چیخ نکل جائیگی دل ہوگا تپاں   تم مجھے ڈھونڈوگی افسوس نہ پاؤگی نشان
عافیت بخش جو بازو تھے وہ ہونگے بے جاں   گرم بوسے وہ کہاں، دور ہو جن سے خفقان
میں نہ ہونگا تو بہت یاد کروگی مجھکو

(بنگالی۔ قاضی نذرالاسلام)

گُل تریاک

سیمابی ہوائیں ہانپتے پودے دھوپ کے گھونٹ چڑھاتے ہیں
اُس پر بھی کلیجا بھنتا ہے اور پیاس سے ہانپے جاتے ہیں
غش کھائے گلاب کے رس کو چوس رہی ہے سنہری اک تتلی
نازک نازک، سہمی سہمی، چھوئی موئی، دُبلی پتلی
اور ہونٹ ترے سوتے ہیں ادھر، ہیں نیم تبسم آلودہ
اے کاش کبھی دیکھوں میں انہیں پیغام سے اپنے آسودہ
جنبش نہ ہو یونہیں سوتی رہ اے نیند کی ماتی متوالی
اور ہوش سبھوں کے کھوتی رہ اے نیند کی ماتی متوالی
باریک سنہری نقاب تو اپنے روئے زیبا سے نہ ہٹا
ہر ذرہ نگاہ خیرہ ہے اور تاک میں ہے تپتا صحرا
یہ تیرے خزانۂ زر کی نگہباں ہے اور اُس کو چھپائے ہے
وہ پردا ہے جو چشم زخم سے حسن کو تیرے بچائے ہے
سورج کی دمکتی لپٹ جو ہے شفاف تن بلوریں میں
(محلول ستارے یا موتی مینائے مے انگوریں میں)

وہ سہم کے ہو نہ فرار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی
اور فتنے نہ ہوں بیدار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی

مد و جزر موج دریا سینے کے ابھرنے ڈوبنے ہیں
تھکتی ہی نہیں تکنے سے جنہیں نوخیز حبابوں کی آنکھیں
وہ برف کی ایسی سفیدی مگر ڈورے جو لہو میں سانس کے ساتھ
ساحل کا رانہ ہے تشنہ لبی، اس درجہ قریب اور آئیں نہ ہاتھ
جیسے ہو دہن میں موج کے کف، زریں زریں، تاباں تاباں
تند اور سرکش، تاہم دلکش، بر خود نازاں، بر خود پیچاں

کروٹ نہ بدل، کروٹ نہ بدل، اے نیند کی ماتی متوالی
ہے ہے نہ مچل، للہ سنبھل، اے نیند کی ماتی متوالی

کیوں چشمہ نہ پھوٹے اپنی ہنسی، کیوں توڑے نہ دم پیلی تتلی
منظر ہو جب ایسا تاب شکن کیوں غیر نہ ہو حالت دل کی
جب ایسی شدید محبّت ہو، کثرت سے گلابی میخواری
جب آہ بھڑکتا شعلہ ہو اور اشک دہکتی چنگاری
کیوں لپٹیں نہ جلتی آنکھیں مری، چھاتی کے سرخ انگوروں سے
کیوں رحم کی رکھوں آس نہ میں ہشیار نما مخموروں سے

جلتی ہے جو چھاتی جلنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی
جو کچھ بھی ہو آنکھیں ملنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی

جل جائے تو میرے دل کی کلی شاداب و شگفتہ ہو جائے
ہو خاک اور پھر یہ خاک اُڑ کر اک کیفِ ابد میں کھو جائے
مَس ہو کے گل و صندل سے مہکتے جسم کی تیرے خوشبو سے
(قسمت پہ نہ کیوں وہ ناز کرے جس کو ہوں میسر یہ بوسے)
مانندِ "گلِ تریاک" کھلے تنہا و خنک خاموشی میں
پروانے پہ گزرے جو گزرے شعلے سے مبارز کوشی میں

اک تشنگی و مدہوشی ہے، اے نیند کی ماتی متوالی
اور حسرتِ ہم آغوشی ہے، اے نیند کی ماتی متوالی

(ابن العربی)

جنگ ثعلبہ

رزم گہہ ثعلبہ کی اور وہ دشمن کا جسد — کم تھے ہم اور وہ بہت سمجھے کہ میداں مارا
فتح کا تاج خیالی بھی رکھا فرق پہ کج — پیش از جنگ ہوا جنگ کا وارا نیارا

عورتیں اُن کی چلانے لگیں طعنوں کے سناں — جن میں تیزاب سے بڑھ چڑھ کے تھی شورانگیزی
اپنے جامے سے ہوئی جاتی تھی ایک اک باہر — مات مقراض کو کرتی تھی زباں کی تیزی

"کھول کر کان یہ سن رکھو زبوں صید ہو تم — پابجولاں ہو، اطاعت جو نہ منظور کرو
ورنہ اپنے ہی لہو میں ابھی ڈوبے ہو گے — بولو، بولو، کیا کیا فیصلہ، جلدی بولو"

ہم ڈکارے کہ ہوا مرحلہ کیا سہل میں طے — سر ہمارے جو نظر آنے لگے قدموں میں
پڑھ لیا تم نے مقدر کا ہمارے لکھا! — فیصلہ کر بھی لیا، خاک میں ملنا ہے ہمیں

ابر آلود ہے مطلع، نہیں کچھ غم اس کا — صبح کا چہرۂ پرنور نظر آئے اور آئے
فتح پھر اپنی ہے، چین اپنا ہے، آزادی بھی — کھیت رہنا ہے ہمیں، جان ہے جانی تو جائے

دشمن آگے بڑھا ترتیب سے ہم بھی جھپٹے — دشت کی ریگ کو گلزار بنایا ہم نے
جادۂ خنجر خونریز سے منزل طے کی — توڑیں دشمن کی صفیں، رنگ جمایا ہم نے

پھنس کے جب موت کے پھندے میں تڑپتے تھے وہ — ہم یہ چلائے یہی فیصلہ آخر ٹھہرا
قبضہ خنجر کا رہے اپنے قوی پنجے میں — اور سینوں میں تمہارے ہو کھُبا پھل اُس کا

(جولائی ۱۹۴۲ء) — (ترجمہ از عربی)

معمّائے ہستی

وہ وقت آیا قریب آخر کہ ہو گی معزول شب کی ملکہ
وہ مملکت ہے نہ دبدبہ ہے، نڈھال ہے چال، زرد چہرہ
بس اب تصرّف میں رہ گیا ہے اخیر شب کا اخیر حصّہ
ستارہ اک جھلملا رہا ہے نشاں گزشتہ شہنشہی کا
بجائے دیہیم اک کرہ ہے کہ جس پہ چھائی ہے تیرگی سی
اُدھر بڑھا تاجدار مشرق اِدھر روا شب کے سر سے سرکی
سیاہ انجم نے کھایا گھونگٹ ہوا وہ ظلمت کا چاک پردا
وہ کھولا سورج نے اپنا پرچم، بڑھا صبا نے سحر کا کڑکا
وہ کھولی کرنوں نے اپنی چوٹی، پہاڑ کی چوٹیوں سے اٹکی
ابھی دھندلکا تھا گھاٹیوں میں کہ اُن پہ بھی اک لٹک سے لٹکی
سپید وار آسماں کی جانب کہر بھی انگڑائی لے کے اُبھرا
اُبھر کے سمٹا، سمٹ کے پھیلا، بنے گا غازہ رُخِ سحر کا

وہ پا کے بوراکیوں کی گھوڑوں کا ہو کے بیتاب ہنہنانا
قریب جب تک وہ آئیں آئیں زمین ٹاپوں سے کھودے جانا
وہ ہمہمہ ہے وہ غلغلہ ہے کہ جس سے شورِ نشور پیپا
اِدھر تو کڑکی زمیں کی چھاتی اُدھر کلیجا فلک کا دھڑکا
نقیبِ مشرق نے وا کیئے ہیں سنہری ایوان کے دریچے
وہ دیکھا خورشید خاوری نے فصیل سے چرخِ چار میں کے
وہ اٹھا طوفان تجلّیوں کا وہ ہو گیا ختم خوابِ شبنم
نہائے نورانیت کے چشمے میں برگ و بار و بہار باہم

حسین و نوخیز روز روشن ترانۂ صبح گا رہا تھا
کمر کو باندھا جو کارواں نے رواں ہونے کو سوئے صحرا،
عجیب دشوار منزلیں ہیں عجیب پُر ہول مرحلے ہیں
جو اِس جگہ زمہریری خطے تو اُس جگہ گرم منطقے ہیں
کہیں پہ ویران پہاڑیاں ہیں، کہیں پہ سنسان وادیاں ہیں
کہیں جو ہیں گھات میں درندے تو غول صحرا بیاں وہاں ہیں
اور ان سے بڑھ کر مہیب وحشی کہیں ہیں انسان بطرزِ حیواں

لہو کا پیاسا، حریص و جابر کہ جس سے ہو گرگ بھی پشیماں
کہیں کہیں سنسناتے میداں میں نخل جیسے ہو مست بادہ
لچکتے قامت کا لہلہانا کہ جس پہ لوٹ خود ہے سایہ
ہواؤں میں پتّوں کا سرسرانا، اُبلتے چشمے کی یاد جیسے
برستے پانی کی جھم جھماہٹ، دلِ حزیں بھی ہو شاد جس سے
کہیں کہیں سبز گھاٹیاں ہیں ہوائیں جن کو ہیں گدگداتی
وہ بہتی زلفیں وہ نرم پہلو کہ بحر کو جھرجھری ہے آتی
قریب ساحل کے سینہ تانے غریب مانجھی کا دل لبھانے
تسلیاں دے کے غم مٹانے، غموں کی پھر یاد بھی بھلانے
مگر یہ اُن کے لئے ہے ساماں امید ہے دستگیر جن کی
وہ جن کی رُوحوں کا ہے نشیمن بہشت کی خوشگوار خنکی

اور ایک ہم ہیں کہ اپنا مرکز بجائے فردوس کے جحال ٹھہرا
یہ سوچ رہتا ہے لحظہ لحظہ کہ زیست کا کیا مآل ٹھہرا
جو وقت کی رہگزر میں ملنے کا جشن جدائی نہیں نتیجہ
تو ایسے ملنے کا مدعا کیا، فراق جس کا ہے پیش خیمہ

جدا جو ہونے کو ہم ملے ہیں تو کیا جدا ہو کے پھر ملینگے
جو پھول مرجھا چکے ہیں اک بار کیا وہ مرجھا کے پھر کھلینگے
نہ ہوگا ایسا کہ ہوگا ایسا یہ شبہ ہوتا ہے دل میں پیدا
وہ غیب دانی کہ من گڑھت ہے یہ کہہ رہی ہے کہ ہوگا ایسا
یہ بات ڈالی ہے کس نے دل میں کھلا نہ انساں پہ راز اس کا
نہ کھل سکا ہے نہ کھل سکے گا نہ جانے کتنوں نے سر کھپایا
ملیں تو کیوں اور مل گئے تو جدا پھر اک دوسرے سے کیوں ہوں
یہ ناگزیری یہ تلخ کامی، کہیں اگر کچھ تو سرنگوں ہوں
مجاز ہم ہیں نہ دخل ہم کو، کبھی لیا عندیہ کسی نے
سپرد تقدیر کر دیا ہے خدا نے یا اپنی بے بسی نے
کہاں سہانی وہ شام عشرت، تمام نغمہ تمام رحمت
کہاں یہ غمگیں سحر الٰہی عذاب یکسر کمال زحمت
سیاق میں زندگی کے لیکن شمار یہ بھی ہے اور وہ بھی
نہیں ہے تفریق یکسر مہ اگرچہ ہے فرق اور بدیہی
شکستہ دل ہوں فسردہ خاطر، دماغ جیسے چراغ کشتہ
نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، مثال حرف غلط نوشتہ

حواس مختل، نظر پریشاں، رگوں میں اک تھرتھری بھری ہے
گزشتنی ہے جہان فانی، جو ہے تو پائندہ ابتری ہے
جسے بھی دیکھو اُسے تغیر، جو شے ہے بیزار کرنے والی
یہاں کا جینا بھی ہے خیالی یہاں کا مرنا بھی ہے خیالی
شباب کے دوستوں کو پہنچے سلام آخر مری طرف سے
یہ مانا ہم پھر کبھی ملیں گے مگر نہ اس طرح پھر ملیں گے
یہ وقت کا یا پلٹنے والا، کرے گا طیار اور خاکہ
ہمیں وہ ہوں گے مگر نہ ہوں گے فساد ایسے کھڑے کرے گا
جو صبح کی ٹھنڈی روشنی تھی ہوئی تمازت جب اس میں پیدا
تو دن ڈھلا اور شام آئی اور اُس کا انجام کار ہے ٹڑکا
وداع ہوتا ہوں اب میں تم سے یہی تھا انجام آشنائی
صدا جرس کی ہوئی ہے صحرا، یہ دل کی دھڑکن پیام لائی
یہ ہوکے ین اور یہ تپتے میداں کہ ذرہ ذرہ ہے شعلہ ساماں
خدا کی اک ذات کے سوا ہے یہاں کسے زندگی کا امکاں
خیال ماضی کے جو دکرتے ہیں اس خرابے میں آہ کیا کیا
تغیرات اور اُن کے اسباب کرتے ہیں انتباہ کیا کیا

نہ جانے کھو جاتی پھر کہاں ہیں افق سے ہو ہو کے پار نظریں
تلاش کس کی ہے آرزو کیا جو اُٹھتی ہیں بار بار نظریں
نگاہِ معصوم کو ستاتی ہیں کیوں یہ پرچھائیاں اُبھر کے
نکل پڑے ہیں کہاں سے یارب یہ قبر کے تیرہ فام سائے
سوالوں کا ایک سلسلہ ہے، کہاں سے آئے کدھر ہے جانا
اگر ہے جانا تو کب ہے جانا، قضا نے ڈھونڈا ہے کیا بہانا
خیال میں انتشار، تاہم شدید و بے سود یہ تمنّا
کہ پڑھ لے انسان کلکِ قدرت نے جو ہے اُس کی جبیں پہ لکھا
دوام دو اور اُن کے مابین ایک نقطے پہ ہم سٹکے ہیں
وہ خوفناک اُن کے بھید جن کے ہجوم شبگوں میں ہم گھرے ہیں
وہ سوگوار اُن کی ظلمتیں ہیں ستم جو آنکھوں پہ توڑتی ہیں
کبھی جو مٹتے نہیں مٹائے، نقوش وہ گہرے چھوڑتی ہیں
یہ گھپ اندھیرا یہ وحشی موجیں یہ رقصِ گرداب یہ ہوائیں
وہ چیخ کے بعد کی خموشی وہ چیختے طوفاں کی سائیں سائیں
جنھیں میسر ہے امنِ ساحل ہماری اُن کو خبر ہو کیونکہ
خبر ہو لیکن نہ آنکھ نم ہو خبر نہ ہونا ہی اس سے بہتر

شراب اور عشق کے مغنی کا گیت تھا جو ابھی سنایا
بہشت اور حورِ عین و کوثر کے خواب جو دیکھتا رہا تھا

مگر وہ کم بخت جس کی عمرِ طبیعی ٹھہری ہے تین بیسی
جو اک طرف مختصر ہے کتنی تو اک طرف ہے طویل کیسی
مرے حواسوں کو باختہ کرتی ہیں نہ خوش کرنے والی خوشیاں
شراب، حوریں، محبت اور اُن سے جو ہے منسوب ساز و ساماں
کبھی تو اک ساتھ سب کا حملہ، کبھی مقابل ہر ایک تنہا
پناہ مانگو پناہ مانگو کہ ہوگا مشکل چھڑانا پیچھا

عجیب خوش فہم تھا وہ دانا کہ جس نے یوں حل کیا معمّا
خرد ہوئی خشک اور کہنہ، اسے ہے لازم طلاق دینا
انیس خلوت جو دخترِ رز ہو تو اُٹھے کچھ لطف زندگی کا
نکاح ثانی اسی سے کیجے ——— کوئی ٹھکانا ہے ابلہی کا!

لگائی صوفی نے ہانک بڑھ کر کہ "خاک سے جز و خاک ہوگا"

مراد اس سے فنائے تن ہے، نہیں ہے کچھ روح سے علاقہ
تجھے ملی رُوح کی جو دولت تو فرض ہے یہ پتا لگانا
کہ اصل مقصود اس کا کیا ہے کہاں ہے اس چشمے کا خزانہ
مگر یہ تھا جستجو کا ثمرہ ندامتیں، رونا، کڑھنا، مرنا
تذبذب اچھا ہے چشمِ بینا کہ راہ یہ اختیار کرنا

یہ اُس کا نغمہ تھا جو فنا و بقا کے چکر میں پڑ گیا ہے
شکار اپنے فریب کا ہے شکار کرنے چلا تھا "لا شئے"

گناہوں پر اشک بار ہو کر کہا یہ ہم سے مسیحیت نے
طمانیت وہ کبھی نہ دیکھی جو بخشی ہے میری سلطنت نے
یہ لفظ کچھ کم ہیں یا زیادہ، الٰہی اک آن کو دکھا دے
وہ خلد جلوے سے جن کے کھل جائیں دیدہ و گوش آدمی کے

یہ قول ہے ایک "ناستک" کا خودی کو پوچھو، خدا تمہیں ہو
خدا نہیں ہو تو کیا ہو پھر تم، اگر خدا سے جُدا نہیں ہو

مجھی میں جلوہ ہے نورِ حق کا، میں ہی حقیقت میں ہی صداقت
خدا نہیں ماسوا" انا" کے یہی ہے روشن بس ایک آیت
اگر تھا منصورِ مرد دانا تو اُس سے بڑھ چڑھ کے تھے وہ انا
کہ جن کے سنگ و سناں کا آخر ہر ذرا اُس کا ہُوا نشانا
یہ مانا ہر قطرے سے لہو کے صدائیں "حق حق" کی آ رہی تھیں
وہ ہڈیاں چور چور ہو کر کسی کے جوڑے بھی جڑ سکی تھیں؟

"جو چاہو وہ کھاؤ اور پیو تم، مگن رہو چھوڑ و فکر کل کی
"گراں بغیر اس کے زندگی ہے شرابِ ایک جرعہ سے بھی"
یہ قول اک بادشاہ کا ہے عجب گیا جیاین کی جو بنسی
زبان ملتی جو خوک کو بھی تو کہتا "یہ تو ہے بیر ہی سی"
یہ آدمی ننگِ آدمیت جو گھاس سمجھا ہے زندگی کو
یہ مر کے بنتا ہے گھاس پھر خود مویشی چرتے ہیں پھر اسی کو
نہاد اس کی ہے چونکہ خاکی یہ پستیوں کی طرف ہے مائل
ذلیل خوشیوں کو ڈھونڈھتا ہے جو اس کے حق میں ہیں سم قاتل
مگر بتائیں وہ جن کی پیداخت اچھے ماحول میں ہوئی ہے

بلندیوں پہ ہے جن کا مسکن تمہاری ہمت کیوں پلٹ گئی ہے
خواص تم ہیں کہاں سے پیدا ہوئے ہیں گھوڑوں کے اور گدھوں کے
تمہاری غیرت کو کیا ہوا ہے، یہ کیسے اطوار تم نے سیکھے

جب ایک زاہد سے میں نے پوچھا، یہ بڑبڑاتا ہوا وہ گزرا
حیات بعد الممات سب کچھ، نہیں ہے دنیا کا کچھ بھروسا
یہ کہہ کے بیت الحزن کی جانب چلا وہ کرنے کو آہ و زاری
بیادِ عصیاں، بخوفِ دوزخ، بہ بیمِ پرسش، بہ ترسِ خواری
یہ زہد کی تیری اللہ اللہ حیاتِ مابعد پہ تو ایقاں
مگر فسانہ جو عہدِ ماضی تو حال اک خواب ہے پریشاں
بتا تو کچھ رازِ زندگی سے بھی تجھ کو اے شخص آگہی ہے
کہ عیشِ جنت عذابِ دوزخ ہی کی فقط رٹ لگی ہوئی ہے
جوان تو، پیرزالِ دنیا، عظیم وہ ہے حقیر تو ہے
مثالِ ذرہ گریز پا ہے خودی کا اپنی اسیر تو ہے
سمجھنا اپنے کو حاصلِ کل تری دنائت ہے گمرہی ہے
وہ تو کہ اک خواب ہے خدا ماں خبر نہ سر کی نہ پیر کی ہے

نہ تجھ کو قدرت نہ تجھ میں طاقت، ہما ہمی دیکھنے ہی کی ہے
ابد کی بنیاد اور تجھ پر، چلا چلی جب لگی ہوئی ہے!
تو اک دقیقہ کی بے ثباتی وہ جب کہ ہو سانس آتی جاتی
یہ طبقہ اسفل، یہ تیری حالت، مگر یہ دعوے خودی کے باقی
یہ تیری ہستی کہ جیسے طائر قفس میں ہو دور آشیاں سے
قفس بھی وہ سخت گیر مرضی ملے نہ جو آسماں کے ٹالے
مگر ہے پھر بھی یہ تجھ کو حیرت یہ کیوں ہے کب سے ہے وجہ کیا ہے
کہاں سے آئے، کہاں ہے جانا، پھر اک حیرت، یہ قصہ کیا ہے
تو اور لافانی کیسا جنوں ہے خبر ہے آیا جہاں میں کیونکر
دو پاسے دو جانور ملے تھے اور آ گئے اک شرمناک منظر
ترا وجود اس کا ہے نتیجہ، مچا تھا اک ڈند خواہشوں کا
یہ تیرا نقشہ اور اس پہ غرہ کہ تیری خاطر ہے سب تماشا
وہ تو کہ بچوں کی طرح حیران ہو کے ہر شئے کو دیکھتا ہے
نکل کے ظلمت سے اوّل اوّل دو چار انوار سے ہوا ہے
فنا کے جھونکوں میں بہہ رہا ہے کہ جیسے آندھی میں خشک پتا
پھوار بوندوں کی یا ہو جیسے، ہوا نے بہیم جسے نچوڑا

تجھے نہ تھا اس سے پہلے بہرہ تمیز سے کچھ نہ ہوش سے کچھ
نہ تجھ کو فردا کی آگہی تھی نہ واقفیت تھی دوش سے کچھ
ہزار خطروں میں تو گھرا ہے ہمیشہ گریاں ہے شاد خنداں
کبھی ہے سینہ تنور سوزاں، کبھی ہے آہوں کا گرم طوفاں
یہ تیری برخود غلط پسندی یہ کس مپرسی کا اُس پہ عالم
کبھی ہے بازیچہ گاہِ حرماں، کبھی ہے پامالِ غصّہ و غم
تجھے نہیں علم کیوں تو آیا، کہاں سے آیا، کہاں ہے جانا
نہ وقت جانے کا تجھ کو معلوم پھر بھی بنتا ہے تو سیانا!
تجھے ہے لیکن گھمنڈ پھر بھی کہ بہتر ہیں شاہکار تجھ سے
یہ خواب بیداریوں میں احمق بڑا "بنا" ہوشیار تجھ سے
حریص عیش دوام غفلت میں تیرے لیل و نہار گزرے
بہت ہی ناکامیاب گزرے، بہت ہی ناخوش گوار گزرے
یہ زرد چہرہ یہ سست اعضا یہ جسم لاغر یہ ہیٹی قسمت
مگر یہ کاوش فسانہ کہہ دوں اگر ملے مہلت زباں کی لکنت!

(۱۹۴۲ء) (حاجی ابو علی البزدی)

ضبطِ اشک

موت نے تجھ کو نہیں چھینا تھا مجھ سے جب تک
مرگ پر دوستوں کی اشک بہائے کیا کیا

وقت ہے تیرے لئے اب مرا ایک اک آنسو
رات دن گوہرِ نایاب لٹائے کیا کیا

اشک پینے پڑے تسکین کسی نے جب دی
بن گئی جان پہ ہنسنا پڑے آئے کیا کیا

(سنہ ۱۹۴۲ء)

(عربی)

شہرِ عبرت

۱

آ کہ افسانہ سلاطیں کا سناؤں تجھ کو — محوِ راحت جو کبھی تھے مرے ایوانوں میں
دو گھڑی رہ کے یہاں رختِ سفر بار کیا — ہو گئے آوارہ ہلاکت کے بیابانوں میں
جس طرح سایۂ سرِ شام بکھر جاتا ہے — کھو گئے وہ بھی یونہی تیرہ شبستانوں میں
جس طرح جھونکوں میں آندھی کے ہو تنکا کوئی — لے اُڑی موت اُنھیں، سر تھے گریبانوں میں

۲

اب ہے وہ دَور نہ وہ مستیٔ ہنگامِ شباب — پھر بھی ان آنکھوں نے کیا کیا نہ تماشا دیکھا
دیدنی دبدبہ ہیبت تھا دمِ اوجِ کمال — جو ہوا مدِّ مقابل وُہی پامال ہوا
جس طرف چل گئی حملے کی مرے بادِ سموم — مل گیا خاک میں وہ ملک نہ ہر گز پنپا
جس طرف تیغِ سیہ تاب کی بجلی چمکی — روزِ روشن میں ہوئی تیرگیٔ شب پیدا
پابجولاں ہوئے وہ شاہ کہ تھے جانِ شہی — جن کی صولت کا ہر اک دل پہ تھا سکّہ بیٹھا
میرا فرمان ہوا سارے جہاں پہ جاری — آب تھا میری سیاست سے فلک کا زہرا

۳

اب ہے وہ دَور نہ وہ مستیٔ ہنگامِ شباب — خواب تھا دیکھ کے اک بار جو دیکھا نہ گیا
تاک میں دام بچھائے ہوئے بیٹھی تھی اجل — اس طرح صید ہوا میں کہ تڑپ بھی نہ سکا
اک غریو اٹھا مری فوجوں سے لیکن بے کار — جاں نثاروں کی خوشامد کا بھی جادو نہ چلا
سن مسافر جو سخن تھا مرے لب پہ دمِ مرگ — کاش جب زندہ تھا اس قول پہ عامل ہوتا
"ہوسِ جاہ نہ کر، رُوح کو پامال نہ کر — پُرِ سرور ایک قناعت کا ہے جرعہ اچھا"
ورنہ کل دے گی لحد ہڈیوں کو تیری فشار — کہہ کے یہ مجھ سے جو بیگانہ تھا آیا آیا
تجھ کو چھاتی سے ہمیشہ یونہی لپٹا دُونگی — مجھ سے تو دُور رہا اور بہت دُور رہا

۴

میں شہنشاہ تھا اور شاہ مرے حلقہ بگوش — کانپ اُٹھتے تھے جدھر آنکھ مری اُٹھتی تھی
ہاتھ باندھے ہوئے استادہ رہا کرتے تھے — سر بلندی وہ مری اور وہ اُن کی پستی
مر کے سب ایک سیہ خانے میں محبُوس ہوئے
ہو گماں جس پہ جسامت کا وہ ہے تاریکی!

(۱۹۴۲ء) — (عربی)

سورما

نہ تجسّر اُس کا شیوہ، نہ لب آشنائے شکوہ
نکے رشک سے تکلّم وہ خموشیاں شگفتہ

وہ غرور خود پسندی سے بری وقار اُس کا
جو غیور طبع اُس کی تو وفا شعار اُس کا

جو ہے عالی اُس کی ہمّت تو بلند حوصلہ ہے
وہ ہے آپ اپنی منزل وہ اکیلا قافلہ ہے

وہ خطر کو ڈھونڈتا ہے وہ اجل سے کھیلتا ہے
پڑے جو مصیبت اُس پر وہ خوشی سے جھیلتا ہے

نہ قرار ایک جا ہے نہ قیام ایک جا ہے
وہ شرر ہے یا چھلاوا، کہ سمومِ برق زا ہے

کبھی چھاؤنی ہے بن میں کبھی دشت میں ہے ڈیرا
کبھی شام اس جگہ ہے کبھی اُس جگہ سویرا

وہ خیالِ گرم رَو ہے جو نہ دم لے اور نہ ٹھہرے
نہ پہاڑ اُس کو روکیں نہ تو غار گھیرے گھیرے

وہ جدھر بھی اُس کا بڑھنا تو ہوا اُس سے بھی آگے
وہ پچھاڑیں کھانا اُن کا، وہ کراہنا بچھڑ کے

کبھی نیند سے کسی نے نہیں دیکھیں بھاری آنکھیں
مگر اُس پہ وہم بھولی نہ ہوں بیداری آنکھیں

وہ ہمیشہ منتظر ہے کہ عدو ہوں جب مقابل
کھُلیں تیغ کے وہ جوہر کہ ہو موت ساتھ گھائل

(سنہ ۱۹۴۲ء)

(عربی)

میاں محمد حنیف مالک اُردو اکیڈیمی لاہور نے باہتمام ملک محمد عارف خاں پرنٹر دین محمدی پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

١٧٩ ٨٠٨٤٨١

(دب) ٣٢٢٦٦

Date	No.	Date	No.